برائے تاوان

احمد اقبال

تحریر میں سادگی اور شگفتگی کو برقرار رکھتے ہوئے نہایت گہری باتیں کہہ جانا ہی کمالِ فن ہے۔ یہ خوبی برسوں کی ریاضت کے بعد ہی کہیں نصیب ہوتی ہے۔ احمد اقبال اس فن میں یدِطولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کی یہ صفت اب محتاجِ بیان نہیں رہی۔ اپنے ہنستے مسکراتے مشہور کرداروں کے لیے اس بار جو بساط اُنہوں نے جمائی ہے وہ بہ ظاہر ایک سیدھی سادی تفریحی کہانی نظر آتی ہے مگر درحقیقت اس میں موجود معاشرے میں پھیلی ہوئی خرابیوں کے وہ سارے بد نما رنگ موجود ہیں جو ماحول کو آلودہ کر ڈالتے ہیں۔ نچلی سطح سے اوپر کی سطح تک جو خطرناک اور جان لیوا امراض ملک و قوم کے جسمِ ناتواں میں ناسور بنتے جارہے ہیں، ان کی نشان دہی ہنسی ہنسی میں کرداروں کی زبانی کرادینا احمد اقبال کا ہی خاصہ ہے۔

بُزدل اور انسپکٹر رحم دل کی کہانیاں آپ پہلے بھی پڑھ چکے ہیں اور ان باغ و بہار شخصیات سے خوب واقف ہیں۔ اس مرتبہ یہ ایک بڑے سودے کو تکمیل تک پہنچانے کی ذمے داری قبول کر بیٹھے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس راہ میں خود اُن کی جان کے لالے پڑ گئے۔

ایک مقدس نقش کی چوری کا قصہ، مجرم اس کی واپسی کے لیے خطیر رقم کا مطالبہ کررہے تھے

ساری دنیا میں شاید ایک اخبار والے ہی وہ بدنصیب لوگ ہیں جن کو پورے سال میں ایک دن کی چھٹی بھی نہیں ملتی۔

الحمدُللہ کہ ایسی سنگین صورتِ حال ابھی اپنے پیارے ملک پاکستان میں پیدا نہیں ہوئی۔ یہاں ہر عید پر دو دن اخبار شائع نہیں ہوتا۔ اس طرح انہیں بھی سال بھر میں دس بارہ چھٹیاں مل جاتی ہیں جو دوسرے پیشوں سے بہرحال بہت کم ہیں۔

کچھ محکمے ہفتے میں دو دن چھٹی کرتے ہیں یعنی سال میں ایک سو چار دن۔ پھر وہ چھٹیاں جن کو ابھی تک انگریز کی زبان میں GAZETTED یعنی سرکاری کہا جاتا ہے۔ پھر ہڑتالوں کی چھٹیاں۔ سردی کی چھٹیاں اور گرمی کی چھٹیاں۔ چنانچہ کم سے کم چار مہینے ورنہ اسکول کالج کی طرح آٹھ مہینے چھٹی میں گزرتے ہیں۔

اس کے باوجود مطالبے جاری رہتے ہیں کہ فلاں کے یومِ ولادت اور فلاں کے یومِ شہادت کو سرکاری تعطیل قرار دیا جائے ورنہ....

حکومت کے لیے مناسب ہوگا کہ وہ ہر سال اعلان کردے کہ اس سال فلاں فلاں دن کام ہوگا، انشاءاللہ۔

اس دن میں باری کی چھٹی پر تھا۔ ہفتہ وار چھٹی نہ ملنے کا حل اخبار والوں نے یہ نکالا ہے کہ وہ سب کو باری باری چھٹی دیتے ہیں۔ کسی کو پیر کو چھٹی ملتی ہے تو کسی کو منگل والے دن۔ اب یہ آپس کی بات ہے کہ ضرورت کے مطابق وہ ایک دوسرے سے چھٹی کا تبادلہ کرلیں۔

میری ہفتے وار چھٹی کے لیے پیر کا دن مقرر ہے مگر ایک پیر کو میرے ساتھی رپورٹر کی چوتھی منگنی تھی چنانچہ میں نے پیر کو حاضری دی اور بدھ کی چھٹی کی۔ بدھ کام شدھ۔ اتفاق سے اس دن ہڑتال بھی ہوگئی۔ میں دفتر میں ہوتا تو کام عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ ہوجاتا۔ بھاگ دوڑ بڑھ جاتی۔ اسپتالوں کی طرح اخباروں میں بھی ہنگامی صورتِ حال کا اعلان ہوجاتا ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے ساتھی، خصوصاً وہ ساتھی جس کی چوتھی منگنی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی، اپنی قسمت کو کوس رہا ہوگا۔ سارے شہر سے توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی کی خبریں آرہی ہوں گی اور ایڈیٹر صاحب بار بار سرد آہ بھر کر کہتے ہوں گے "لو میاں، اسکور بارہ ہوگیا۔ اب وہ سرخی ذرا بدل دو۔ پہلے کیا لکھا تھا ہم نے؟ دس.....دس کی جگہ بارہ کردو...اور ہاں، بھئی ضمیمہ لانا پڑے گا، آج اگر یہی صورتِ حال رہی اور رہے گی انشاءاللہ۔ ابھی تو دس بجے ہیں ہماری گھڑی میں۔ گویا صحیح وقت ہوا نو بج کر پچیس منٹ دوپہر بارہ بجے اگر ایک ضمیمہ آجائے تو کیا مضائقہ ہے۔ دھڑادھڑ بکے گا۔"

میرا جیل کی کوٹھریوں سے ذرا بڑے دو کمروں والا فلیٹ جو اس وقت ویران ہوتا تھا، آج آباد تھا۔ اس کو میں اپنا مزار شریف کہتا ہوں تو ڈاکٹر صائمہ سخت خفا ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک یہ کباڑ خانہ

ہے۔ پکّے تھانے دار انسپکٹر رحم دل خان' المعروف بہ ظالم خان۔ اسے پاگل خانہ قرار دیتا ہے کیونکہ اسے آج تک مجھ سمیت یہاں جو ملا' وہ پاگل تھا یا ہونے والا تھا۔

ہم چار یار قالین پر نیم دراز گاؤ تکیوں پر کہنیاں رکھے تاش کھیل رہے تھے۔ اب آپ سے کیا پردہ' ہم جوا کھیل رہے تھے۔ آج کا بھاؤ ایک روپیہ پوائنٹ تھا۔ مہینے کے آخری دنوں میں بھاؤ اتنا گر جاتا تھا کہ ہم دس پیسہ پوائنٹ پر کھیلتے تھے۔

اس بات پر ہم سب کا اتفاقِ رائے تھا کہ جوا کھیلنا گناہ ہے اور جرم بھی ہے مگر اللہ معاف کرنے والا ہے' اس کے بغیر کھیل میں سنسنی بھی تو پیدا نہیں ہوتی۔ بالکل ایسا لگتا ہے کہ جیسے بیوی سے عشق کرنا۔

کال بیل پر' جو درحقیقت خوفناک آواز والا بزر ہے' میں کاہلی سے اٹھ کر دروازے تک گیا۔ میرے لیے اس وقت کسی کا آنا قطعی غیر متوقع تھا۔ سب جانتے ہیں کہ بدھ کو میں اس وقت کہاں ہوتا ہوں۔ مزید یہ کہ آنے والا بزر کی آواز سے محظوظ بھی ہو رہا تھا۔

"یہ کون الو کا پٹھا ہے۔" میں نے کنڈی کھولتے ہوئے خفگی سے کہا۔

"تمہارا باپ!" ظالم خان نے اندر قدم رنجہ فرما کے کہا۔

میں نے کہا "کیا تمہاری انگلی بٹن پر چپک گئی تھی؟"

اس نے کہا "بٹن نیچے پھنس گیا تھا' خراب ہو گیا ہے۔"

"پھر اب خود کیسے ٹھیک ہو گیا" میں نے کہا۔

"خود کون ٹھیک ہوتا ہے" اس نے حاضرینِ محفل پر ایک مشکوک نگاہ ڈالی "میں نے ایک ہاتھ مارا تو ٹھیک ہوا۔ ایسے ہی ٹھیک کرتا ہوں میں سب کو۔ چلو راستہ چھوڑو' مجھے اندر آنے دو۔"

میں نے کہا "اگر وارنٹ لائے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ نامراد لوٹ جاؤ۔"

اس نے مجھے یاد دلایا "میں تمہارا دوست بھی ہوں۔"

"اللہ بچانے والا ہے مجھے۔ ہوئے تم دوست جس کے' دشمن اس کا آسماں کیوں ہو" میں نے راستہ چھوڑ دیا۔

اس نے اندر آ کے پھر شرکائے بزم کو شک کی نظر سے دیکھا اور میز پر بیٹھ گیا۔ وہ نیچے بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے پتلون پھر تنگ ہو گئی تھی۔ کمرے میں یہی ایک بلند مقام تھا۔ کرسیاں میں نے اپنی خواب گاہ یعنی دوسرے جیل کی کوٹھری جیسے کمرے میں منتقل کر دی تھیں۔

اب ظالم خان نے زیادہ تفصیل کے ساتھ جائے واردات کا معائنہ شروع کیا۔ ملزمان کا اقرارِ جرم ان کی صورتوں پر صاف پڑھا جا سکتا تھا۔ ثبوت' شہادت' سب سامنے تھے۔ جرم کو چھپانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہوتا جیسے ظالم خان کا اپنا پیٹ چھپانا۔ یہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ والی بات ہوتی۔

سب کے پتّے ان کے سامنے الٹے رکھے ہوئے تھے۔ چائے کے خالی کپ ایک سائڈ میں تھے۔ ان میں بجھائی جانے والی سگریٹوں کے ٹوٹے' ایک تھانے دار کی نگاہ کو سوئمنگ پول میں ڈوب مرنے والوں کی لاشوں کی طرح نظر آ رہے ہوں گے۔ ایش ٹرے میں ایک دوست نے بارہ مسالے والے پان کو اپنے منہ کے کمیچر میں اچھی طرح گھوٹ کے اگلا تھا۔ یہ اسے کسی مقتول کا خون نظر آتا ہو گا۔ خون اس کی اپنی آنکھوں میں بھی اُترا ہوا تھا۔

میں نے کہا "اس وقت تمہارے یہاں نازل ہونے کی کوئی معقول وجہ ہے؟"

اس نے سہلایا "میں تمہارے دفتر گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ تم چھٹی پر ہو۔"

"اور تم کیا ہڑتال کامیاب بنانے کے لیے نکلے ہو؟"

اس نے میرے سوال کو نظرانداز کر دیا "یہ کون لوگ جمع ہیں یہاں؟"

"یہ میرے دوست ہیں۔ دشمن بھی ہوں تو جب تک خون خرابا اور قتل وغیرہ نہ ہو' کسی تھانے دار کو دخل اندازی کی ضرورت نہیں" میں نے کہا۔

اس نے معزز حاضرین پر ایک پُرخباثت نگاہ ڈالی "میں سب کو جوا کھیلنے کے الزام میں گرفتار کر سکتا ہوں اور تم کو جوئے کا اڈّا چلانے پر۔"

"ہم صرف تاش کھیل رہے تھے" میں نے کہا۔

ظالم خان نے اپنی بات جاری رکھی "میں اپنی آمد کو اچانک چھاپا مارنے کی کارروائی قرار دے سکتا ہوں اور جوئے میں لگائی جانے والی رقم کی برآمدگی بھی دکھا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "یہ رقم تو ایک فلاحی ادارے کو چندہ دینے کے لیے اکٹھی کی گئی تھی۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں تمہاری اتھارٹی کو چیلنج کر رہا ہوں' تم یہاں سے مال مسروقہ یا منشیات بھی برآمد کر سکتے ہو۔"

"مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی" وہ بولا "مگر ان شرفا کے سامنے نہیں۔"

میں اسے دوسرے کمرے میں اور پھر کچن میں لے گیا کیونکہ اس نے ایک کپ چائے کا مطالبہ کر دیا تھا "تمہیں میرے مہمانوں کو شرفا کہہ کے ان کی بے عزتی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔"

وہ کچن میں مختلف ڈبّے کھول کے دیکھتا رہا "ان میں ایک چور ہے۔"

میں نے کہا "تم شرافت علی کی بات کر رہے ہو؟ وہ چور تھا.... کئی سال پہلے' اور کچھ عرصہ جیل میں بھی رہا۔"

"تین سال" ظالم خان بولا "آج کل بھی وہ پرانی گاڑیاں خریدنے اور بیچنے میں مصروف ہے لیکن درحقیقت وہ چوری کی گاڑیاں اِدھر سے اُدھر کرتا ہے۔ چیسس نمبر بدلنا اس کے

بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"رائٹ! وہ کھبّا ہے۔ ہر کام بائیں ہاتھ سے کرنے کا عادی ہے۔"

"تمہارا دوسرا دوست جعلساز ہے۔ پہلے جائداد کی دستاویزات' ڈگری اور سرٹیفکیٹ بناتا تھا۔"

"مبیّنہ طور پر وہ کبھی پکڑا نہیں گیا" میں نے ابلتے پانی میں چائے کی پتی ڈالی "لائق علی نام ہے اس کا۔"

"میں اسے مہلت دے رہا تھا کہ وہ جعلی نوٹ چھاپنے لگے تو اسے ایک بار ہی پکڑ کے دس سال کے لیے اندر کردوں۔"

میں نے کہا "معاف کرنا یار' اس عید پر تم نے مجھ سے دس ہزار لیے تھے۔ ہزار ہزار کے نوٹ۔"

"وہ تو یار۔ بینک بند تھے چار دن تک۔ پانچویں دن واپس کردیے تھے میں نے" ظالم خان نے بُرا مان کے کہا۔

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم نے مجھ سے رشوت لی تھی۔ بتانا صرف یہ تھا کہ وہ سب نوٹ جعلی تھے۔ تم نے جو واپس کیے' وہ اصلی تھے۔"

اس نے ایک آہ بھری "آج کل وہ کیا کررہا ہے؟"

میں نے کہا "سونی اور نیشنل کی مصنوعات بنا رہا ہے۔ پہلے صرف نقلی استری بنائی تھی۔ وہ چل گئی۔"

"جلنا تو تھا' لگاتے ہی جل گئی ہوگی۔"

میں نے کہا "میں نے چل گئی کہا تھا پھر اس نے واشنگ مشین بنائی' آج کل ٹیپ ریکارڈر بناتا ہے۔ ان پر نیشنل آف جاپان لکھتا ہے۔ آدمی ذہین ہے لائق علی۔ آف میں ڈبل ایف استعمال کرتا ہے۔"

"NATIONAL OFF JAPAN؟" ظالم خان جذباتی ہونے لگا "میرا بیٹا بھی خرید لایا تھا گدھے کا بچہ۔"

میں نے اسے چائے پیش کی "تیسرے کو تم اچھی طرح جانتے ہوگے۔ تمہاری برادری کا ہے۔"

ظالم خان سوچ میں پڑ گیا "ہاں۔ دیکھا ہوا لگتا ہے بندہ!"

"عاقل خان' نیا نیا ٹریفک پولیس میں اے ایس آئی بنا ہے۔ بڑا فرض شناس افسر ہے۔ بیس سال حوالدار رہا۔"

"فرض شناس!" ظالم خان غصے میں دھواں دینے لگا "اسی لیے یہاں بیٹھا ہوا جوا کھیل رہا ہے۔ چوروں اور جعلسازوں کے ساتھ۔ شہر میں کہیں ٹریفک جام ہو رہا ہوگا۔ اس پر تم کالم لکھو گے اخبار میں اسی کے خلاف۔ تم کو شرم آنی چاہیے۔"

میں نے کہا "پہلے آتی تھی اب نہیں آتی۔"

اس نے خالی کپ رکھ دیا "بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی۔ تم جیسے نامور صحافی' بلند پایہ شاعر اور عظیم کالم نویس اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کے ایسے دوست ہوں' کتنے افسوس کی بات ہے؟"

میں نے کہا "اس سے زیادہ باعثِ شرم تمہاری دوستی ہے مگر

یہ بتاؤ کہ آج میری اتنی تعریف کس لیے؟"

اس نے کچھ سوچ کے کہا "مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تمہارے فائدے کی بات ہے۔ خاصا مال بنا سکتے ہو تم۔"

میں نے دلچسپی کا اظہار نہیں کیا "پیسہ ہاتھ کا میل ہے۔ ویسے بھی آج میں ذرا مصروف ہوں۔"

اس نے کہا "کنگلے ملک کے پھکڑ صحافی۔ تمہیں ڈاکٹر صائمہ سے شادی کرنی ہے یا نہیں؟"

میں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے "کیا کوئی صنعت کار اغوا ہوگیا ہے اور مجھے اغوا کرنے والوں سے مذاکرات کرنے ہیں؟"

"تمہیں سودا بھی کرانا ہے۔"

میں نے کہا "ظالم خان۔ ایک بات سن لو کان کھول کے۔ اغوا کرنے والے تاوان کی جتنی رقم کا مطالبہ کررہے ہیں' وہ میری کوشش سے نصف بھی ہوسکتی ہے' چوتھائی بھی۔ جتنی رقم میں کم کراؤں گا اس کا کمیشن ہوگا بیس فیصد۔ یس آر نو؟"

"پہلے تم دس فیصد لیتے تھے۔"

میں نے کہا "روپے کی قیمت گر رہی ہے۔ مہنگائی اور میری عمر بڑھ رہی ہے اور ڈاکٹر صائمہ کی شرط ہے اپنا مکان۔ شادی سے پہلے۔"

"وہ تم نہیں بناؤ گے خواہ کمیشن سو فیصد ملے... مگر ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "ایک لاکھ ایڈوانس!"

ظالم خان نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا "تمہارے ساتھ کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی پہلے۔ تمہیں اعتبار کرنا چاہیے۔"

ظالم خان نے غلط نہیں کہا تھا۔ یہ ظالم خان کا تیسرا کیس تھا۔ پہلی بار ڈاکو ایک شخص کو غلط فہمی کی بنا پر اٹھا لے گئے تھے۔ ان کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے مجھے سفارتی مشن پر بھیجا گیا۔ جب انہیں پتا چلا کہ عیسیٰ خاں کے بجائے وہ موسیٰ خاں کو اٹھا لائے ہیں تو انہوں نے تاوان کی رقم کے مطالبے پر نظرِ ثانی کی۔ انہوں نے موسیٰ خاں کی رہائی کے لیے پانچ لاکھ مانگے جو میری کوشش سے دو لاکھ ہوگئے تھے۔ جب موسیٰ خاں گھر پہنچ گیا تو ظالم خان نے مجھے تیس ہزار دلوا دیے تھے۔ تین لاکھ کا دس فیصد۔ سارا کریڈٹ ظالم خان نے لیا تھا جس نے چھاپا مار کے موسیٰ خاں کو برآمد کرلیا۔ خبر

میں تاوان کی ادائیگی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ آئی جی صاحب نے اس کے کندھے پر ایک پھول کا اضافہ کردیا تھا۔

دوسری بار معاملہ ایک قیمتی گاڑی کا تھا۔ اس کی انشورنس دس لاکھ کی تھی۔ گاڑی نہ ملتی تو انشورنس کمپنی کو دس لاکھ دینے پڑتے۔ وہ گاڑی اس سے زیادہ مہنگی تھی۔ میری پرانی گڈول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انشورنس کمپنی نے دس فیصد کمیشن پر سودا کرلیا۔ گاڑی صرف دو لاکھ میں ایسے واپس مل گئی جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھی۔ مجھے اسی ہزار دلوانے والا ظالم خان ہی تھا ورنہ گاڑی کا مالک اور انشورنس کمپنی والے دونوں ہی کام نکل جانے کے بعد وعدہ خلافی پر آمادہ تھے۔ سب انسپکٹر رحم دل خان کو مسروقہ کار برآمد کرنے پر تعریفی سند ملی تھی۔

یہ سب یاد کرکے میں نے کہا "چلو یار۔ ایڈوانس میں تمہیں ففٹی پرسنٹ ڈسکاؤنٹ، پچاس ہزار نکالو۔"

اس نے نفی میں سرہلایا "میں کیا اپنی جیب سے ایڈوانس دوں؟"

میں نے کہا "دراصل یار رحم دل خان۔ ایک تو کرایہ دینا ہے مجھے پورے چھ ماہ کا۔ مالک مکان نے مجھے اس شخص سے ملوادیا ہے جو مجھے بڑی شرافت سے بے دخل کرے گا۔ راتوں رات دوسرے کرایہ دار کو میرے گھر میں آباد کرے گا اور مجھے مشورہ دے گا کہ میں اس واقعے کو بھول جاؤں۔"

ظالم خان ہنس پڑا "یار، تم کالم لکھنا اس کے خلاف۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میں ڈاکٹر صائمہ کو شادی سے پہلے ہی بیوہ کرنا نہیں چاہتا دوست۔ بولو پچیس ہزار دوگے؟"

"بزدل!" ظالم خان نے پتلون کی پھولی ہوئی جیب میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور گن کر پچیس نوٹ میرے سامنے ڈال دیئے "کرایہ ضرور ادا کردینا اب۔ سب مت اڑادینا اس پاگل خانی پر۔"

"میرے پاس تیرہ ہزار تو بچیں گے یار۔" میں نے نوٹ سمیٹ کر کہا "اور یہ پاگل خانی آپ نے کیسے کہہ دیا ڈاکٹر صائمہ کو؟"

"پاگل نہ ہوتی تو محبت کسی بزدل سے نہ کرتی۔ مجھے تو سخت حیرت اور افسوس ہوتا ہے۔ اس نے اپنا مستقبل تاریک کرلیا۔"

میں نے کہا "اغوا کس کا ہوا ہے؟"

"اغوا کسی آدمی کا نہیں ہوا ہے۔" ظالم خان بولا۔

"عورت کا ہونے سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میرا ریٹ وہی رہے گا اور دیگر شرائط بھی" میں نے کہا۔

وہ بولا "معاملہ عورت کا بھی نہیں۔ ایک بہت قیمتی چیز کا ہے۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا "ہاہا۔ دیکھا تم نے تھانے دار صاحب۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک دن میری شہرت پاکستان سے بڑھ کے ساری دنیا میں پھیل جائے گی۔ کیا ملکہ الزبتھ کے تاج سے کوہِ نور ہیرا چوری ہوگیا ہے؟"

وہ کندھا ہلا کے کراہنے لگا "خبیث الزماں۔ کہاں ہاتھ مارا ہے؟"

میں نے ہمدردی سے کہا "سوری یار۔ کیا بیوی نے ڈنڈا مارا تھا یہاں؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "بیلن۔ میں نے کچن میں رومینٹک ہوکے... خیر، یہ معاملہ ذرا مختلف ہے۔ کچھ حساس نوعیت کا ہے اور اس میں رازداری کی بڑی اہمیت ہے۔ خطرناک بھی ہے۔"

"کس حد تک؟ خطرہ تو خیر ہمیشہ ہوتا ہے" میں نے کہا۔

اس نے بڑی مسرت سے مجھے مطلع کیا "اس بار تم فوت بھی ہوسکتے ہو۔ خاصے روشن امکانات ہیں کہ کمیشن کی رقم سے تمہاری آخری رسوم شاندار ہوں۔"

"ایسی صورت میں... کیا مجھے پہلے کوئی وصیت نامہ تیار نہیں کرلینا چاہیے؟ جس میں واضح کردیا جائے کہ میری مرگِ ناگہاں کے بعد میرا قرض کس سے وصول کیا جائے۔ میرے اسبابِ خانہ کی فروخت سے ہونے والی آمدنی قرض اتارو، ملک سنوارو اسکیم میں دی جائے اور ڈاکٹر صائمہ....." میں نے کہا۔

ظالم خان نے دانت نکالے "اس کی فکر مت کرو یار۔ ہم جو ہیں تمہارے دوست۔ تم ذرا مثبت انداز میں سوچو۔ اس بار تمہارے لیے تخت یا تختہ والی بات ہے۔ بفرضِ محال تم کامیاب ہوگئے۔"

"میں ناکام کب ہوا؟ سوائے عاشقی کے سابقہ تجربات کے۔ میری ساکھ ایسے ہی تو نہیں بنی اور خود تم جو کاندھے پر تین پھول سجائے پھر رہے ہو۔" میں نے کہا "یہ میری کامیابی نہیں تو کیا ہے؟"

"میری ترقی کا سبب ہے میرا شاندار سروس ریکارڈ۔ تم ایک ناکام صحافی، ناکام شاعر اور ناکام عاشق ہو۔ اگر تم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو ڈاکٹر صائمہ بھی تمہیں چھوڑ کے کسی تیلی یا پنساری سے شادی کرلے گی۔ تم شادی کی شرط پوری کرسکتے ہو۔ اپنا مکان خرید سکتے ہو۔ دو بیڈ روم کا ایک خوب صورت فلیٹ دس لاکھ میں آسانی سے مل سکتا ہے۔ کسی بہت اچھی جگہ..."

"دس لاکھ...." میں نے محسوس کیا کہ میرا حلق خشک ہورہا ہے اور آواز شاید اسی لیے پھنس رہی ہے۔

ظالم خان نے مجھے پانی کا گلاس پیش کیا "دس لاکھ سکہ رائج الوقت کے نصف جس کے پانچ لاکھ ہوتے ہیں.... تمہیں مل سکتے ہیں۔"

میں نے سوچ کے حساب لگایا "وہ قیمتی چیز پچاس لاکھ کی ہے؟"

ظالم خان نے اقرار میں سرہلایا "اصل قیمت کا تو مجھے علم نہیں لیکن چور اس کے پچاس لاکھ مانگ رہا ہے اور بتا چکا ہے کہ اتنے ہی لے گا۔ باٹا کے ریٹ ہیں اس کے۔ پچاس لاکھ پانچ پیسے کم۔ اس سے کم پر بات ہی نہیں ہوسکتی کیونکہ خریدار اور بھی ہیں

جو اس سے زیادہ دینے پر راضی ہیں۔"

"کوئی بڑا وضع دار اور اصول پرست چور ہے.... اگر فائدہ ہے تو کسی اور سے بات کیوں نہیں کرتا۔"

"یہ بات اتنی آسانی سے تمہاری عقل شریف میں نہیں آئے گی۔"

میں نے کہا "اجمیر شریف اور مزار شریف کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ کسی چیز کے ساتھ شریف لگایا جائے تو لوگ اسے نواز فیملی کی ملکیت سمجھنے لگتے ہیں۔ عقل میری اپنی ہے....."

میں نے کہا "تمہاری بات میں سمجھ لوں گا۔"

"تم نے اچھا کیا مزار شریف کا حوالہ دے کر۔ کیونکہ یہی جائے واردات ہے" ظالم خان بولا۔

میں نے کہا "تمہیں کیا معلوم میں کس کے مزار شریف کی بات کررہا تھا، یہاں تو ہر قدم پر ایک مزار شریف ہے کسی ڈبا پیر کا۔"

"لیکن زندہ انسانوں کا مزار شریف ایک ہی ہے۔ افغانستان میں۔"

میں نے سوچ کے کہا "مگر وہاں اتنی قیمتی چیز کیا ہو سکتی ہے؟"

ظالم خان عادتاً مونچھیں مروڑتا رہا "تم جانتے ہو اسٹنگر میزائل کیا ہوتا ہے؟"

"ہاں۔ وہ میزائل جو ایک پورٹیبل توپ سے چلایا جاتا ہے۔ توپ کو کندھے پر اٹھائے پھرتے ہیں مجاہدین۔ میزائل ایسے جہاز کے پیچھے لگ جاتا ہے جیسے پاگل کتا آدمی کے پیچھے۔"

ظالم خان کو مثال پسند آئی۔ "بالکل ٹھیک۔ مزار شریف سے ایسے ہی پانچ میزائل چوری ہو گئے ہیں۔"

"تم نے میرا وقت ضائع کیا۔ میرے دوست انتظار کررہے ہیں۔"

"دوست!" وہ طنز سے بولا "ایک چور اور ایک تھانے دار۔ دونوں ایک جگہ بیٹھ کے جوا کھیل رہے ہیں۔ ایک صحافی کے گھر میں۔"

میں نے کہا "بے شک یہ تمہارے لیے قرب قیامت کی نشانیاں ہوں گی مگر یہ مت بھولو کہ انہی کے تعاون سے میرا کاروبار چلتا ہے اور تمہیں ترقی ملتی ہے۔"

"تم انہیں چلتا کردو۔ کیونکہ میں بات پوری کیے بغیر جانے والا نہیں ہوں۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ مجھے اوپر سے ہدایات ملی ہیں۔ تمہیں زندہ یا مردہ اسلام آباد میں پیش کرنے کی۔ اگر تم نے انہیں رخصت نہ کیا تو میں بھگادوں گا۔"

"وہ سب سمجھ دار ہیں۔ بھاگ گئے ہوں گے پہلے ہی" میں نے کہا "ان کا اتنی دیر خاموش بیٹھنا مشکل تھا۔"

میرا خیال درست تھا۔ میرے دوست مال سمیت کے فرار ہوگئے تھے۔ خود میں بھی یہی چاہتا تھا۔ ان کی دوستی سے زیادہ مجھے دس لاکھ کی ضرورت تھی۔

علاج دل

اسپتال میں ایک دل کے مریض سے مزاج پرسی کے لیے آنے والے دوست نے پوچھا "یہاں دل کی دھڑکن کو کم کرنے کے لیے بھی تمہیں کچھ مل رہا ہے؟"

مریض نے جواب دیا "ہاں، بوڑھی، بدصورت نرس۔"

ظالم خان ایک کرسی پر سکون سے بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے ہوائی جہاز کے ٹکٹ نکالے "اپنی جیب سے خرچ کرکے تم فرسٹ کلاس ائرٹریول صرف خواب میں کرسکتے تھے۔ یہ ٹکٹ آج رات کی فلائٹ کے ہیں جو آٹھ بجے جائے گی۔ کل تم واپس آسکتے ہو۔"

میں نے ٹکٹ نہیں لیے "تم نے کیسے فرض کرلیا کہ میں جارہا ہوں۔"

وہ ہنسا "انکار کرہی نہیں سکتے تم۔ دس لاکھ کی مجبوری الگ ہے۔ تمہاری مجبوری الگ۔ اسلام آباد سیاست اور بیوروکریسی کا گڑھ ہے۔ ہر ملک کا سفارت خانہ ہے وہاں خواہ وہ ملک لالوکھیت سے بھی چھوٹا ہو۔ بہت سے افریقی اور جنوبی امریکا کے ملک ایسے ہیں کہ ان کا نام بھی اجنبی لگتا ہے۔"

"میں نے اولمپک گیمز کی تقریب میں ایسے بہت سے نام دیکھے تھے جو بالکل فرضی لگتے تھے" میں نے کہا "اسلام آباد میں کسی سفیر نے طلب کیا ہے مجھے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا "اسلام آباد میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ تمہیں ایک آرٹ گیلری میں ان سے ملنا ہے" اس نے ایک کارڈ پیش کیا۔

میں نے کارڈ پر نظرڈالی۔ "خیال آگاہی، ڈائریکٹر۔" کیا عجیب سا نام ہے مگر سنا ہوا لگتا ہے۔ یاد آیا، یہ ایک مصور خاتون ہیں۔ خود بھی تصویرِ حسن ہیں ماشاء اللہ مگر ابھی تک میری ان سے براہِ راست کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ انہوں نے مجھے کیسے یاد کیا..."

"یہ ان سے ملو تو پوچھ لینا۔ میرا کیا تعلق آرٹ وغیرہ سے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ آرٹ گیلری سے کوئی چیز چوری ہوگئی ہے، انتہائی سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود۔ یہ چیز کسی نامعلوم افریقی ملک سے لائی گئی تھی اور سفارت خانے والوں نے اسے ایک بین الاقوامی نمائش کے سلسلے میں حکومت کے حوالے کردیا تھا۔ نمائش سے پہلے ہی یہ چیز غائب ہوگئی۔ ذمے داری آگئی حکومت پر لیکن چوروں کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایک ہفتے بعد پیغام ملا کہ پچاس لاکھ میں وہ چیز واپس مل سکتی ہے۔ سفارتی دباؤ بھی ہے اور حکومت بھی کوتاہی کے الزام اور بدنامی سے بچنے کے لیے پچاس لاکھ دینے پر تیار ہے۔ براہِ راست وہ محکمے اس معاملے میں

پریشانی سے دوچار ہیں۔ وزارتِ داخلہ جس کے ماتحت پولیس ہے اور دوسرے قانون نافذ کرنے والے ادارے۔"

"جو لاقانونیت کے بل پر خون آشام آدم خور شیر ہوتے جارہے ہیں۔ ایف آئی اے اور سی آئی اے۔ انسدادِ رشوت ستانی' اینٹی کرپشن..."

"مجھے کیا بتارہے ہو" ظالم خان چڑ کے بولا "پہلے میری سن لو۔ دوسری مصیبت ہے وزارتِ خارجہ کے لیے۔"

"وہاں بزدل کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں ہوگا۔"

"رائٹ مگر چور تمہیں اپنی برادری کا رکن بلکہ روحانی پیشوا سمجھنے لگے ہیں۔ مجھے رشک آتا ہے کہ کتنی تیزی سے تمہاری بدنامی کی شہرت نے نیک نامی کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ ان چوروں نے کہا کہ معاملہ تمہاری معرفت طے ہوگا اور کسی سے بات نہیں ہوگی۔"

"یہ تو خیران کی ذرّہ نوازی ہے" میں نے انکساری سے کہا "مگر رحم دل خان' تم جانتے ہو کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں مگر میری بات کوئی نہیں سنتا' بتاؤ میں کیا کروں؟"

"تم رخصت لو اپنے توپ صاحب سے۔ الوداع کہو اپنی ڈاکٹر صائمہ کو۔ کوئی وصیت نامہ بھی لکھنا چاہو تو وقت ہے اور سدھارو اسلام آباد۔ رات آٹھ بجے تمہیں جہاز پر لادنا میری ذمّے داری ہے۔" اس نے میز پر بید بجاکے کہا "اسلام آباد ائرپورٹ سے تمہیں گاڑی سیدھے "خانس آرٹ گیلری" لے جائے گی۔ گلے مل لو' کیا پتا اس کے بعد میدانِ حشر میں پھر ملاقات ہو۔"

اس کے جانے سے پہلے ہی کالو مکرانی نمودار ہوگیا "ام کو تیرا مالک مکان بھیجا اے ڑے۔ ابھی بولو کدھر کو جائیں گا۔ باہر کہ اوپر۔" اس نے انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کو پستول کی طرح بناکے آسمان کی جانب کیا۔

میں نے ظالم خان کی طرف دیکھا "تھانے دار صاحب' اس کو بتاؤ کہ فی الحال تو میں اسلام آباد جارہا ہوں۔ وزارتِ خارجہ اور وزارتِ داخلہ..."

"اڑے' کھاڑجہ اور داخلہ ماخلہ ام نئیں سمجھتا۔ کرایہ لاؤ ابی' نئیں تو تمارا اخبار میں تمارا پھوٹو چھاپے گا۔ کیا.... ایک دم لاش کا۔"

ظالم خان نے کہا "یار' اس کے منہ پر مارو کرایہ۔ ابھی تو میں نے تمہیں پچیس ہزار دیے ہیں۔"

میں نے دانت پیستے ہوئے پچیس میں سے بارہ ہزار مکرانی کو ادا کیے "اپنے مالک مکان سے کہہ دینا کہ.... تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں۔ بس شرافت میں دے دیا ہے کرایہ۔ یہ نہ سمجھے کہ میں ڈر گیا تھا دھمکیوں سے۔ کسی دن غصّہ آگیا تو کالم لکھ دوں گا اس کے خلاف۔ آخر وہ سمجھتا کیا ہے خود کو۔ ہٹلر کی اولاد!"

ظالم خان نے قہقہہ مارا "یار چلو اب سال بھر کی مہلت مل گئی ہے۔ واپس آ کے کالم لکھنا بشرطِ زندگی۔"

میں نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا "تم اس بدمعاش کے سامنے بھیگی بلی بنے رہے؟"

"وہ.... دراصل یار..... میں نے اسے کہا تھا کہ آج ہی موقع ہے کہ قرض وصول کرلو۔ لیکن یہ بھول جاؤ کہ تم کچھ کرسکتے ہو' سوائے دیوانی مقدمے کے۔ بے دخلی اور کرائے کی وصولی کے لیے قانونی طریقہ ہے تمہارے پاس۔ ورنہ یاد رکھو وہ صحافی ہی نہیں' میرا دوست بھی ہے" ظالم خان نے کہا۔

"پلیز گیٹ آؤٹ!" میں نے کہا "تم دوست نہیں دشمن ہو میرے۔"

○☆○
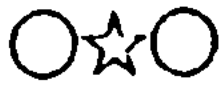
مخالف سمت سے آنے والے کی چوڑائی زینے سے کچھ ہی کم تھی اور وہ کسی مشتعل گینڈے کی طرح آرہا تھا چنانچہ میں نے ایک طرف دُبک جانے میں ہی خیریت جانی۔ میں ایسا نہ کرتا تو وہ بلڈوزر مجھے چپٹا کرتا ہوا میرے اوپر سے گزر جاتا۔ ظاہر ہے پھر میں بھی گزر جاتا۔

اسے جگہ دینے کے لیے میں نے سانس بھی اندر کھینچ لیا تھا اور دیوار سے چپک گیا تھا مگر وہ ایک قدم پہلے ہی رک گیا۔ میں ایک زینہ نیچے تھا لیکن میرے اور اس کے قد میں بھی آٹھ انچ کا فرق تھا چنانچہ ہم برابری کی سطح پر ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرسکتے تھے۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے اور اس کی وجہ کا اندازہ بھی کرسکتا تھا۔

"اوباؤ!" اس نے اپنا مگدر جیسا پہلوانی ہاتھ میرے ناتواں کندھوں پر رکھ دیا "پان ایتھے کون کھاتا ہے۔"

میں نے بہروں کے اسٹائل میں ایک ہاتھ تو اپنے کان پر رکھا "کیا.....؟ کون جاتا ہے؟ کہاں جاتا ہے پہلوان؟"

دوسرے لمحے میرے کان میں جیسے بادل گرجا اور میرا کان سُن ہوگیا "اوئے پان.... پان.... کون کھاتا ہے ایتھے پان؟"

میں نے کان میں انگلی ڈال کے ہلائی "پہلوان جی! میں بہرا تو نہیں ہوں کہ آپ اتنا چلّا رہے ہیں۔"

پہلوان گوشت کا آتش فشاں پہاڑ تھا جو پھٹنے کے قریب تھا۔

"جو بھی کھاتا ہے پان' سمجھو اس دی گئی جان۔"

میں نے کہا "اس عمارت میں چالیس کمرے ہیں۔ ایک سو چالیس لوگ ہیں۔ ایک سو انتالیس پان کھاتے ہیں۔ ایک سو چالیسواں میں ہوں' تم دیکھ سکتے ہو۔ میری جاں بخشی ہوگئی' کیا اب میں اوپر جاسکتا ہوں؟"

جواب کا انتظار کیے بغیر میں پہلوان کو دباتا ہوا تیر کی طرح نکل گیا۔ میرے لیے یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ ایسے جان لیوا تجربات مجھے پہلے بھی ہوئے تھے۔ پہلے مجھے افسوس ہوتا تھا یا غصہ آتا تھا۔ اب رشک آتا ہے توپ صاحب کی خوش قسمتی پر۔ اصولاً انہیں بہت پہلے مقتول ہوجانا چاہیے تھا' ان کے قاتل اسی پہلوان

کی طرح غصے میں غبارے کی طرح بھرے ہوئے خنجر پستول لئے گھوم رہے تھے مگر توپ صاحب ابھی تک خیر و عافیت کے ساتھ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے کی زندہ مثال بنے روزنامہ "خبر ساز" کی ادارت میں مصروف تھے۔

پہلے اخبار کے نام سے ہی مجھے سخت اختلاف تھا۔ "حقیقت ساز" میرے ایک کالم اور پھر ایک قطعے کی وجہ سے بند کردیا گیا تھا۔ میں اور توپ صاحب سمیت سارا عملہ ایک رات سرکاری مہمان بھی رہا مگر ایک تو صحافی برادری آوازِ حق کو دبانے کی اس مذموم سازش کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دوسرے ہم سب اس تھانے کی حوالات میں تھے جہاں میرا بچپن کا دوست اور کلاس فیلو رحمدل خان انچارج تھا۔ ظالم خان اس کا نام میں نے نہیں رکھا تھا۔ اس کو یہ شہرت اپنے اعمال کی وجہ سے ملی تھی۔ ہم سب نے اس رات تھانے میں پکنک منائی اور ظالم خان نے حقِ دوستی ادا کردیا۔ تھانے کا عملہ پہلے ڈنر کے انتظامات میں مصروف رہا۔ ایک کانسٹیبل شمال کی جانب چکن بروسٹ لینے گیا تو دوسرا جنوب میں ہماری پسند کے روغنی نان لانے کے لیے بھیجا گیا۔ چائے، کافی اور سگریٹ کے سوا توپ صاحب کے لیے اسپیشل پان تازہ تازہ منگوانے کا مسئلہ تھا۔ انہوں نے ظالم خان کو سمجھایا تھا کہ مولا بخش کا نورتن پان اگر کھانے کے بعد آدھے گھنٹے میں نہ کھایا جائے تو ضائع ہوجاتا ہے۔ بالآخر ظالم خان نے مولا بخش کو بھی تھانے بلوالیا۔

دوسرے اخبار کا نام زیادہ قابلِ اعتراض تھا۔ ان کے عملے نے واجبی سا مگر میں نے سخت احتجاج کیا "یہ کیا بات ہوئی توپ صاحب، خبر ساز۔ یعنی خبر بنانے والا۔ ہم کیا خبریں بناتے ہیں؟ ہم خبریں شائع کرتے ہیں۔"

"جیسے بھینس دودھ بناتی نہیں، دودھ دیتی ہے" دہلی کے سابق خوشنویس جواہر رقم موتی قلم استاد لطیف احمد لطف نے عرض کی۔ اب وہ کمپیوٹر پر کمپوزنگ کرتے تھے اور اس عہدِ رفتہ کو یاد کرکے آہیں بھرتے تھے جب کتابت کا شمار فنونِ لطیفہ میں ہوتا تھا۔ توپ صاحب غصے میں انہیں جواہر لال ولد موتی لال کہتے تھے۔

اخبار کے مالک اور مدیرِ اعلیٰ بڑے پہنچے ہوئے مردِ قلندر اور کوئے صحافت کے پرانے شہسوار تفنگ چنگیزی صاحب بڑی خندہ پیشانی سے سب سنتے اور مسکراتے رہے اور اپنے منہ کے مکسچر میں مولا بخش کے نورتن پان کو گھوٹتے رہے۔ پھر انہوں نے سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے سر نکال کے دیکھا۔ دونوں کلوں میں جمع ہوجانے والے لہو رنگ مکسچر کی پچکاری ماری اور غڑاپ سے سر اندر کرکے کھڑکی بند کردی۔ "بات تمہاری برحق ہے عزیزو لیکن سچ یہی ہے فی زمانہ کہ خبر بنائی جاتی ہے۔ جیسے پولیس مقابلے کی خبر اور اپنے کسٹم والوں کے چھاپے کی خبر۔ اللہ سب کی مغفرت کرے۔ بی بی کا ڈنکا بج رہا تھا تو خبر یوں تھی کہ گلاس آدھا بھرا ہوا ہے اور میاں صاحب دہائی دے رہے ہیں کہ ہائے ہائے، آدھا گلاس خالی کرکے دیا ہے ہمیں۔ جب کہ سچ یہ ہے..... کیا ہے سچ بھئی۔"

میں نے گڑبڑا کے کہا "سچ..... سچ تو یہ ہے۔"

انہوں نے قہقہہ مار کے میری بات کاٹ دی "ہاں۔ سچ یہ ہے کہ گلاس بھی اپنا نہیں، آئی ایم ایف کا ہے اور جب وہ لے جائیں گے تو ہم خالی ہاتھ جھاڑ کے قوم کو یہ نہیں بتائیں گے کہ ملک دیوالیا ہوگیا۔ ہم خودی کو بلند رکھتے ہوئے شعر سنائیں گے کہ ۔ رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو۔"

توپ صاحب کا کمال یہی تھا کہ وہ کسی کو بھی لاجواب کرسکتے تھے مگر ناراض کسی کو نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان کا اصل نام کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ بحیثیت ایڈیٹر ان کا نام تفنگ چنگیزی شائع ہوتا تھا۔ تفنگ کے معنی ہیں توپ چنانچہ وہ توپ صاحب کہلاتے تھے۔ یہ نام آسان بھی تھا۔

جب اخبار کا نام بدلا تو انہوں نے اعلان کردیا کہ اب وہ تفنگ چنگیزی نہیں تفنگ بابری ہیں۔ پان کی پیک کو منہ میں محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے سر اوپر اٹھا کے فرمایا "اللہ ہماری مغفرت کرے۔ بڑی غلطی کی ہم نے اور بڑی جہالت کا ثبوت دیا۔ چنگیز خان کا توپ سے کیا تعلق۔ توپ خانہ سب سے پہلے بابر نے استعمال کیا تھا۔ تفنگ بابری سے تاریخی حقائق کا پتا چلتا ہے۔ جیسے اپنے لاہور میں ہے بھنگیوں کی توپ۔ تو میاں کارپوریشن کے بھنگی اسے اپنے آباؤ اجداد کی نشانی سمجھتے ہیں۔ کہاں جھاڑو، کہاں توپ!"

میں جب اوپر پہنچا تو حالات معمول پر آچکے تھے۔ عام طور پر توپ صاحب پیک اگلتے تھے تو لال رنگ کی پھوار سڑک پر یا کسی گاڑی پر گرتی تھی۔ بدقسمتی سے پُرہجوم سڑک پر کسی کا چہرہ گلنار

ریشانے یا شریفانہ لباس پر خون کے چھینٹے نظر آنے لگیں تو وہ سراوپر اٹھا کے گالیاں دیتا تھا اور کوستا تھا مگر یہ سراغ لگانے میں ناکام رہتا تھا کہ پانچ منزلہ عمارت کی سڑک کی جانب کھلنے والی پچاس کھڑکیوں میں سے یہ سوغات کہاں سے آئی تھی۔ توپ صاحب کو پیک تھوکنے میں ایسی مہارت حاصل ہوگئی تھی کہ اس کا ایک چھینٹا بھی اصلی کھڑکی کے نیچے یا دہلیز پر نظر نہیں آتا تھا۔

سال دو سال میں ایک بار ہنگامی صورتِ حال بھی پیدا ہوجاتی تھی جب کوئی انتہائی مشتعل ہوکے سراغ لگانے پر تُل جاتا تھا اور اخبار کے دفتر میں قاتلانہ عزائم کے ساتھ پہنچ کے مجرم کو تلاش کرنے اور اسی کھڑکی سے نیچے پھینکنے کا اعلان کردیتا تھا۔ اس وقت توپ صاحب کی خیر خواہ ٹیم ایک ایسا ڈراما پیش کرتی تھی جس کی ریہرسل وہ کئی بار کرچکے تھے۔ توپ صاحب کاتب کے تخت کے نیچے روپوش ہوجاتے تھے۔ ایڈیٹر کی کرسی پر پشاور کا رہنے والا پائندہ خان بیٹھ جاتا تھا اور سخت مصروف ہوجاتا تھا، کاپی جوڑنے میں یا پروف دیکھنے میں۔ خطرناک مونچھوں اور چمکتے سفید دانتوں والے پائندہ خان کے ڈیل ڈول سے متاثر ہونے کے بعد فریادی دوسروں کی طرف دیکھتا تھا تو سب بے گناہ نظر آتے تھے۔ سب کی اُجلی بتیسی گواہی دیتی تھی کہ وہ پان کے نام سے بھی آشنا نہیں۔ پھر پائندہ خان گرج کے رہی سہی کسر پوری کردیتا تھا کہ "چلو ادھر سے خانہ خراب۔ دروازے سے واپس نئیں جائے گا تو ہم ادھر کھڑکی سے بھیج دے گا۔ یہ اخبار کا دفتر ہے۔ پنواڑی کی دکان نئیں اے۔"

توپ صاحب میز کے نیچے سے نکل کے پھر ایڈیٹر کی کرسی پر رونق افروز ہوچکے تھے اور اپنے اس تازہ ترین کارنامے پر خوشی سے ہنس ہنس کے بے حال ہورہے تھے "بھئی کیا چیز آئی تھی ہمیں تلاش کرتی ہوئی۔ آدمی تھا کہ گینڈے کا برادر خورد۔"

میں نے سخت برہمی سے کہا "توپ صاحب۔ شرم آنی چاہیے آپ کو۔"

انہوں نے پھر وہی کہا جو ہمیشہ کہتے تھے "بزبانِ غالب۔ پہلے آتی تھی اب نہیں آتی۔" وہ قہقہہ مار کے بولے۔

"وہ پکڑلیتا آپ کو تو یہاں سب کے سامنے پان کی پیک کی طرح گھوٹ دیتا۔ آخر کیوں کرتے ہیں آپ ایسی بے ہودگی۔"

توپ صاحب نے ایک اور بیڑا نکالا "یار، اب کتنی بار بتائیں تمہیں۔ جوانی میں سو اسباب تھے تفریح کے۔ پتنگ بازی، کبوتر بازی اور عشق بازی۔ یہ بازی اور وہ بازی۔ ہر بازی اپنے ہاتھ رہی۔ اب نہ شباب کی شوخی رہی کہ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد۔ شراب کیسے پئیں، آباؤ اجداد نے اس قابل ہی نہیں چھوڑا۔ کچھ چھوڑ جاتے تو کیا پتا، ولایتی نہ سہی دیسی چکھ لیتے مگر اب تو سگریٹ پینے نہ پینے کے دلائل میں الجھے رہتے ہیں۔ اللہ مغفرت کرے۔ ٹی وی والے بڑا حوصلہ بڑھاتے ہیں اپنے اشتہاروں سے مگر ڈبیا پر جو لکھا ہے، اسے پڑھ کے ارادہ بدل جاتا ہے۔ بس یہی ایک پان کا شوق ہے صاحبان۔"

میں نے کہا "پان آپ سو نہیں ہزار کھائیں۔ سارا دن چرتے رہیں مگر یہ کھڑکی سے پبلک پر پیک کی بارش کرنا..."

"یار، اسی لیے تو پان کھاتے ہیں ہم۔ مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اور یہ مزے اپنے وطن میں ہی ہیں۔ ولایت میں تو سڑک پر تھوکنے تک نہیں دیتے۔ سڑکیں بھی ایسی ہیں کہ دیکھنے سے میلی ہوتی ہیں اور صاحبان یہ بھی تو غور فرماؤ کہ کتنے جان جوکھوں کا کام ہے یہ۔ تم ہو بزدل، تم نہیں کرسکتے۔"

میں نے جل کے کہا "یہ بہادری نہیں خودکشی کی کوشش بن جائے گی۔"

"صاحبان، موت سے کس کو رُستگاری ہے، آج تم کل ہماری باری ہے۔ تم مجنوں کی طرح لاحاصل عشق میں جان دوگے۔ کسی کو لگ جائے گی کسی اور کے نام کی گولی۔ یہ بتاؤ سوغات کیا لائے ہو؟"

میں نے کہا "ایک کالم ہے پرچون ٹیکس پر اور ایک قطعہ عرض کیا ہے۔

یہ بھی کیا ہے کہ ایک لیلیٰ سے محبت کیجیے
اس کی خاطر جان دینے کی حماقت کیجیے
بھائی مجنوں آپ کو لیلیٰ اگر مطلوب تھی
لازمی تھا جان لینے کی سیاست کیجیے

توپ صاحب ہنسے "تمہارا کوئی رقیب روسیاہ ہے تو اس کے لیے وارننگ..."

میں نے کہا "توپ صاحب، یہ اسٹنگر میزائلوں کا کیا جھگڑا ہے؟"

"کوئی جھگڑا نہیں۔ میزائل اور کلاشنکوف بڑی معصوم چیزیں ہیں۔ یہ خود کسی سے کچھ نہیں کہتے۔ لوگ لڑتے ہیں تو انہیں استعمال کرتے ہیں۔"

"آپ کے خیال میں اب کتنے اسٹنگر میزائل بچے ہیں اور پاکستان میں کتنے آگئے ہیں؟"

پائندہ خان نے بڑے فخر سے کہا "خو ایک امارا سالا کا سر بی لایا اے۔ اپی سب ڈرتا اے اس سے۔ ادر کندھے پر رکھ کے پھرتا اے اور بولتا اے۔ ڈز کرے گا تو روس کا مالک فنا کردے گا۔ بڑا ظالم چیز اے۔"

"ماشاء اللہ۔ تم نے دیدار کیا ہے اس کا بے پیندہ خان۔"

توپ صاحب نے دلچسپی سے کہا "یعنی بقلم خود دیکھا ہے؟"

اگلا آدھا گھنٹا پائندہ خان سے اسٹنگر میزائل کا آنکھوں دیکھا حال سننے میں گزر گیا تو میں نے اپنا سوال پھر دہرایا "ایسے کتنے ہیں یہاں؟"

توپ صاحب نے چشمہ اتار کے پاؤں کرسی پر رکھ لیے "اب قصہ کچھ یوں ہے برخوردار کہ جب یہ ملحد روسی اپنے ہمسایہ اسلامی ملک افغانستان پر قابض تھے تو قبض ہوگیا تھا امریکا بہادر کو کہ لو... ہماری تھانے داری کے منہ پر تو یہ طمانچہ ہے۔ ہم سوتے رہ گئے اور

روسی گھس گئے افغانستان میں۔ کل کو یہ گھس جائیں گے پاکستان میں۔ پھر ہم کسے تباہ کریں گے۔ ایک دوست ان کا ایران تھا۔ اس کے بادشاہ کو دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں۔ پاکستان کو بھی دوست کہتے ہیں وہ۔ ہماری بدقسمتی، روسی بڑے طاقتور حریف تھے۔ ان کی وجہ سے امریکا نے بڑی ترقی کی مگر وہ بڑے کائیاں ثابت ہوئے کہ امریکی جاسوسی کے سارے ادارے اور سیارے وغیرہ دیکھتے رہ گئے۔ کسی کو پتا نہیں چلا اور ایک صبح اچانک بڑے لاؤلشکر کے ساتھ افغانستان میں یوں قدم رنجہ فرمایا کہ جب امریکی جاگے تو بڑے پیچھے چلائے۔ اپنی کنیز خاص اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل سے کہا کہ ان نابکار روسیوں کو نکال باہر کرو مگر کنیز نے عرض کی کہ میری اتنی مجال کہاں۔ ادھر روسیوں نے بھی کہا کہ ہم جانے کے لیے نہیں آئے ہیں۔ ہم تو یہاں بیٹھ کے امریکا بہادر کی چھاتی پر مونگ دلتے رہیں گے اور سب سے پنگا لیں گے۔ چنانچہ بڑے غور و خوض کے بعد امریکا نے سوچا کہ آخر اپنے یار کو ایسے بھی تو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے تھپکی دی پاکستان صاحب کو کہ تم کب سے گا رہے ہو۔ اے مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقتِ شہادت ہے آیا۔ چلو، ملحد روسیوں کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہو جاؤ۔ تو صاحبان، ادھر افغانستان میں ملتِ بیضا کے مجاہد اٹھ کھڑے ہوئے اور ادھر سے ہم نے کہا، لبیک... لیکن دونوں ہی خالی ہاتھ تھے۔ روسیوں کا مقابلہ کیا ڈنڈوں سے کرتے یا جوتیاں مار مار کے بھگاتے انہیں؟ اللہ مغفرت نہ کرے امریکا بہادر کی۔ انہوں نے تسلی دی کہ گھبراتے کیوں ہو، جتنا اسلحہ چاہیے لو۔ براستہ پاکستان آئے گا اور جائے گا۔ چنانچہ ہر قسم کا اسلحہ بے حساب آیا اور بے حساب خرچ ہوا۔ خوب میزائل داغے گئے یہ دیکھے بغیر کہ کون کس پر داغ رہا ہے اور کیوں داغ رہا ہے۔ روسی ملحد تو مجاہدین کے سامنے کیا ٹکتے، بھاگ گئے دُم دبا کے اور اس سے مجاہدین کو خاصی مایوسی ہوئی کہ اب کس سے لڑیں۔ اسلحہ تھا کہ ہر شخص کے پاس تھا اور مزید آ رہا تھا۔ کچھ لوگ لڑنے اور لڑانے والوں کے ایجنٹ تھے جنہوں نے سب کو اکسایا کہ بھئی اب افغانستان تمہارا، آگے بڑھو اور قبضہ کر لو چنانچہ سب آگے بڑھے، پیچھے ہٹنے کو کوئی بھی راضی نہیں تھا۔ اس کے بعد صاحبان، اسلحہ ٹھکانے لگانے کے لیے خانہ جنگی شروع ہوئی جو ابھی جاری ہے مگر جیسا کہ ہوتا ہے، لاکھوں کلاشنکوف اِدھر سے اُدھر ہوئیں اور الحمدللہ اب اپنے پیارے پاکستان میں ایسے استعمال ہوتی ہیں جیسے پہلے لڑائی میں لاٹھیاں چلتی تھیں۔ گولیاں بھی ان کی بہ آسانی ترازو میں تول کے فی کلو کے بھاؤ ملتی ہیں۔ اسی طرح میزائل بھی خورد برد ہوئے۔ جس کے ہاتھ لگا اپنے گھر لے گیا۔"

"امارا سالا کا سر بھی ایک لایا" پائندہ خان نے پھر یاد دلایا۔

"بے وقوف تھا کہ ایک لایا۔ پانچ دس لے آتا تو اچھے پیسے مل جاتے اس کو" توپ صاحب نے پھر کھڑکی کھول کے نیولے کی طرح گردن نکالی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کے پچکاری ماری اور غائب۔ تین منزل نیچے پیش آنے والے رنگین واقعات کے تصور سے ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

میں نے کہا "امریکا بہادر تو واپس خریدنا چاہتے ہیں یہ میزائل۔"

توپ صاحب نے قہقہہ مارا "کیا کہتے ہیں۔ لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا۔ ان کا ایک حساب کتاب کا محکمہ بھی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اتنے میزائل بھیجے گئے تھے۔ اتنے چلائے گئے۔ باقی کہاں ہیں؟ فرق خاصا تھا چنانچہ امریکا بہادر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یہ اتنا ہی خطرناک تھا جیسے بچے کے یا کسی پاگل کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور آجائے اور وہ پھر رہا ہو میلے میں۔ بڑی دوڑ دھوپ کی جناب امریکی ایجنٹوں نے اور محکمۂ سراغ رسانی نے۔ کچھ انہوں نے تلاش کر لیے۔ حساب رکھنے والوں نے کہا کہ ابھی تو سیکڑوں باقی ہیں۔ مجاہدین سے پوچھا، انہوں نے حلف اٹھا کے کہا کہ ہم نے تو روسی کافر پر چلا دیا۔ اسٹنگر میزائل کا تو یہ ہے صاحبان کہ کندھے پر ایک توپ سی رکھی ہوتی ہے۔ ہلکی پھلکی۔ اس میں ڈالا اور غلیل کی طرح چلا دیا۔ اسٹنگر میزائل بھی بڑی کمینی چیز ہے۔ جس کے پیچھے لگ گیا اس کی جان لیے بغیر ٹلتا نہیں۔ پیچھے لگ جاتا ہے جہاز کے اور دُم میں گھس جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جہاز کے دھوئیں کی حرارت کے پیچھے لپکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ امریکا نے بڑی خوشامد کی ہاتھ جوڑ کے۔ ایک ملین یعنی دس لاکھ ڈالر میں ایک میزائل خریدنے کی پیش کش کی۔"

"وئی ائی" پائندہ خان کا منہ حیرت سے کھل گیا "دس لاکھ امریکی ڈالر۔ ساڑھے چار کروڑ روپیہ پاکستانی!"

توپ صاحب ہنسے "تمہارے سالے کا سر ایک کروڑ پتی شخص ہے۔ اگر اس نے ابھی تک میزائل فروخت نہیں کیا ہے اور تم اسے چرا سکتے ہو تو میاں وقت ضائع مت کرو یہاں۔ یہ کام کوئی اور کرلے گا۔ تم جاؤ ساڑھے چار کروڑ کمانے کی فکر کرو۔ پھر اپنا اخبار نکالنا اور ہمیں رکھ لینا اسی تنخواہ پر اپنا چپراسی، جو تم لیتے

ہو۔"

"امارا تو بہت کم تنخواہ اے۔ ام زیادہ دے گا۔"

"بڑی مہربانی۔ پھر ہم بھی مفت کی توڑیں گے تمہاری طرح۔ کام سے جان چھوٹے گی اور یہ بزدل بھی ساتھ ہوا تو انشاء اللہ تم پاگل بھی ہو جاؤ گے ہماری طرح۔"

میں نے احتجاج کیا "توپ صاحب۔ پاگل تو ہم ہیں جو..."

دہلی کے سابق کاتب جو ہر رقم موتی قلم، توپ صاحب کی زبانی داستانِ مجاہد بڑے اشتیاق اور انہماک سے سن رہے تھے، انہوں نے جھنجلا کے کہا "اجی حضرت۔ ہم سب پاگل ہیں یہاں۔ چلئے طے ہوگیا، آگے فرمایئے۔"

"ہاں۔ اب صورتِ حال ایسی ہے صاحبان کہ پہلے خود امریکا بہادر نے جوشِ جنوں میں اسٹنگر میزائل ایسے بانٹ دیے جیسے اندھا بانٹے ریوڑی اور اپنوں کو دے۔ اب اپنوں نے آنکھیں پھیرلی ہیں اور میزائل غائب کردیے ہیں۔ بفضلِ خدا اپنے پاکستان میں خاصے ہیں۔ سرحد اور بلوچستان کے قبائل جو پہلے جنگ میں خود ساختہ بندوق استعمال کرتے تھے، بعد میں راکٹ وغیرہ بھی چلانے لگے تھے۔ اب میزائل کندھے پر سجائے گھومتے ہیں اور وہاں تک اپنے امریکا بہادر کی رسائی نہیں۔ کچھ پتا نہیں کس کے پاس، کس جگہ کتنے میزائل ہیں۔ یار لوگ دبائے بیٹھے ہیں اور بات کرو تو بالکل معصوم بن کے سوال کرنے والے سے سوال کرتے ہیں کہ میزائل! اسٹنگر میزائل؟ یہ کیا ہوتی ہے۔ اصلی سلاجیت جیسی کوئی چیز ہے جو پہاڑوں میں ملتی ہے؟"

میں نے کہا "اندازہ تو ہوگا انہیں کہ قبائلی مجاہدین کے پاس کتنے اسٹنگر میزائل ہیں؟"

"ضرور ہوگا۔ کوئی دو سو بتاتا ہے تو کوئی چار سو۔ ان میں سے کتنے افغانستان میں ہیں اور کتنے پاکستان میں؟ یہ صرف خدا جانتا ہے۔ ابھی تو بس ایک کا پتا چلا ہے جو پائندہ خان کے سالے کے سسر کے پاس ہے۔ خطرہ یہ ہے امریکا بہادر کو کہ میزائل پہنچ جائیں گے عالمی دہشت گردوں کے ہاتھ میں۔ اب فرض کریں صاحبان، صورتِ حال کچھ ایسی ہو جائے کہ ڈرگ مافیا جیسے ادارے کا سربراہ انٹرپول کے قبضے میں آجاتا ہے۔ اسے چھڑانے کے لیے مافیا دھمکی دے سکتی ہے کہ چوبیس گھنٹے میں ہمارا آدمی چھوڑ دو ورنہ ہم امریکی صدر کے طیارے کو نشانہ بنائیں گے۔ وہ جو پہلے مسافر بردار جہاز اغوا کرنے کا رسک لیتے تھے، اب وہ پیغام دے سکتے ہیں کہ ایک کروڑ ڈالر صبح دس بجے تک ادا نہ کیے گئے تو ہم فلاں ائرپورٹ سے دس بج کر پانچ منٹ پر ٹیک آف کرنے والی فلائٹ کو نشانہ بنائیں گے۔ نیویارک جیسے شہر کے ائرپورٹ پر دس بجے دس جہاز پرواز کرتے ہوں گے اور دس مختلف سمتوں میں جاتے ہوں گے۔ ساری فلائٹس کینسل کرنے سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ وہ کسی اور جگہ یا وقت کا انتخاب کرسکتے ہیں۔ تین چار سو مسافروں کی زندگی ہر وقت خطرے میں۔ سنا ہے بین الاقوامی مارکیٹ میں بھی ان میزائلوں کے سودے ہوتے ہیں۔ امریکا بہادر نے تو ایک ملین ڈالر پیش کیے تھے۔ اس سے دگنی رقم دینے والے موجود ہیں۔ ابھی تک کچھ ہوا نہیں مگر ہوسکتا ہے اور یہی خیال امریکا بہادر کی نیندیں اڑانے کے لیے کافی ہے۔ یہ تو صاحبان، کرنی کا پھل ہے۔ افغانستان کو کھنڈر بنادیا۔ اب پرائے گھر کی آگ سے اپنا گھر جلتا نظر آتا ہے تو بدحواسی طاری ہے۔"

پائندہ خان نے اچانک کہا "ہم اپنا سالا کا سسر کو بولے گا کہ اخبار میں اشتہار دے۔ برائے فروخت، ایک اسٹنگر میزائل۔ قیمت پانچ کروڑ۔ پھر ساڑھے چار میں سودا کرے گا، معرفت روزنامہ "خبرساز۔"

"ابے گھاس کھا گیا ہے؟ سی آئی اے والے سب کو اٹھالے جائیں گے۔ ہمیں بھی اور تیرے سارے خاندان کو بھی۔" دہلی کے سابق کاتب نے جھلاّ کے کہا۔

"ابھی دیکھتے جاؤ صاحبان، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ روس کے ٹکڑے ہوگئے تو سارا ایٹمی اسلحہ بھی ریاستوں کے قبضے میں چلاگیا۔ روسیوں نے پورے ملک میں جگہ جگہ ایٹمی میزائل نصب کر رکھے تھے۔ ان سب کو ایک جگہ لانا ناممکن تھا۔ نہ اب امریکا جیسی سپرپاور سے مقابلہ ہے۔ ریاستوں کو اس ایٹمی اسلحے کی ضرورت نہیں۔ ایٹمی سائنس داں ٹیکسیاں چلارہے ہیں روس میں بھی۔ پریشانی یہ بھی ہے کہ کہیں افریقی ممالک یا اسلامی بنیاد پرست یہ اسلحہ نہ حاصل کرلیں۔ سب برائے فروخت ہے۔ امریکا سے سب کی ازلی دشمنی ہے۔ اسے دن میں تارے نظر آنے لگے ہیں۔ اب ساری دنیا میں واویلا کررہے ہیں کہ ایٹمی تجربات مت کرو۔ ایٹمی اسلحہ مت بناؤ۔ کبھی چین سے فریاد کرتے ہیں کہ بڑے بھائی، معاہدہ کرلو۔ عراق کی تلاشی کے لیے انسپکٹر بھیجے ہیں کہ چپّا چپّا چھان مارو۔"

پائندہ خان پھر اپنے خیالوں سے چونکا "ام اپنا سالا سے بات کرے گا۔ خانہ خراب، سسر اس کو بہت ڈراتا اے۔ دھمکی دیتا اے کہ دوسرا شادی بنائے گا تو ہم میزائل چلائے گا۔ سالا اور رام مل کے اسٹنگر میزائل غائب کرسکتا اے۔ پھر وہ دوسرا شادی کرسکتا اے۔ سوا دو کروڑ امارا..."

میں نے کہا "توپ صاحب، پانچ اسٹنگر میزائل میں بھی فروخت کرنا چاہتا تھا لیکن.... کیا خیال ہے، ایک ان پر نہ داغ دیں؟ اپنے حریف اخبار پر؟"

دہلی کے کاتب نے دکھی لہجے میں کہا "بزدل صاحب، آپ تو شب برات پر پٹاخہ چلنے سے بے ہوش ہوجاتے ہیں۔"

"نمبر ملاؤ نمبر۔" توپ صاحب نے چلاّ کے کہا "پاگل خانے والوں سے کہو کہ فوراً گاڑی لے کر آئیں۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اس کی کیا ضرورت ہے، یہ جو بورڈ لٹکا ہوا ہے روزنامہ "خبرساز" کا۔ اسی پر رنگ پھیر کے لکھوادیں "پاگل خانہ۔"

○☆○

آدھے گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا کہ میں ایک ہی جگہ ایک ہی ٹانگ پر کھڑا ایک ہی سمت میں یوں دیکھ رہا تھا جیسے رویتِ ہلال کمیٹی والے عید کا چاند دیکھتے ہیں مگر حسبِ معمول میرا چاند لیٹ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مسکراتے ہوئے آئے گی تو کیا کہے گی۔ سوری، او پی ڈی میں آج بہت رش تھا۔ میرا بلڈ پریشر بڑھتا جارہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر طے کیا کہ اس فضول بات کا دنداں شکن جواب ایک جھانپڑ کی صورت میں دوں گا۔

بالآخر یہ صورتِ حال ایک گنے کا جوس فروخت کرنے والے کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہوگئی جس سے میں نے ایک گلاس جوس بھی نہیں لیا تھا "ابھی پھوٹو ادھر سے۔ ایسا اونٹ کا مافک شور اٹھا کے کیا دیکھتا ہے۔ لوڑکی لوگ کا ہوشٹل ہے یہ۔"

میں نے کہا "لڑکیوں کا ہوسٹل ہے تو میں بھی لڑکیاں ہی دیکھ رہا ہوں، تمہیں دیکھنے کی تو مجبوری ہے۔ جس کو اغوا کروں گا دیکھ بھال کے کروں گا۔"

اس سے پہلے کہ وہ پٹاخے کی طرح اچھلتا یا گنّا لے کر مجھ پر حملہ آور ہوتا، میں نے اسے بڑے گیٹ میں بنے ہوئے چھوٹے گیٹ سے برآمد ہوتا دیکھا۔ اس میں سے وہ بھی سیدھی گزر جاتی تھی۔ ایک بار مجھے گزرنا پڑا تھا تو میں رکوع کی حالت میں گزرا تھا اور قابلِ رشک حد تک صحت مند میٹرن میں گھس گیا تھا۔ ڈاکٹر صائمہ ساتھ نہ ہوتی تو ایک تماشائے عبرت ہوتا۔

سفید کوٹ صائمہ کے ایک ہاتھ پر تھا اور اسٹیتھسکوپ گلے میں۔ اس نے مسکرا کے کہا "سوری۔ او پی ڈی میں آج اتنا رش تھا" تو میں اسے دیکھنے میں اتنا منہمک تھا کہ مجھے دنداں شکن جواب دینے کا خیال ہی نہ آیا۔ اس نے میرے لیے اپنے ساتھ والی سیٹ کا دروازہ کھولا، مجھے سر جھکا کے اندر داخل ہونے کی خاصی مشق ہوگئی تھی۔ اس کے باوجود میرا سر چھت سے لگا۔ پھر میں نے اپنی ٹانگیں سمیٹ کر دروازہ بند کیا۔ میرا سر چھت سے لگا ہوا تھا۔ گاڑی جب اسپیڈ بریکر پر سے گزرتی تھی تو اس کاغذی چھت کی فریاد صاف سنائی دیتی تھی۔

"آکے کھڑے ہوجاتے ہو عین گیٹ کے سامنے کھمبے کی طرح۔ باتیں مجھے سننی پڑتی ہیں" صائمہ نے خفگی سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے مگر تمہاری جو ڈیڑھ بالشت کی سہیلیاں مجھے بجلی کا کھمبا اور ٹیلی فون پول کہتی ہیں، ان کی خاطر میں اپنی ٹانگیں نہیں کٹوا سکتا" میں نے بھنّا کے کہا "کل سے بیٹھ جایا کروں گا گیٹ کے سامنے۔"

"کشکول رکھ لینا سامنے۔ کچھ آمدنی بھی ہوجائے گی۔" صائمہ مسکرائی۔

"اچھا خیال ہے۔ جتنی رقم جمع ہوگی وہ میں جمع کر کے تمہیں دے دوں گا۔ تم اس سے ایک بڑی گاڑی خرید لینا۔"

"تمہارے لیے تو چاہیے بس جتنی اونچی کار۔ میں یہ ننھی منی ہلکی پھلکی پیاری سی گاڑی نہیں بدل سکتی" صائمہ نے بے مروتی سے کہا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "پھر خدا کے لیے اس کی چھت میں اتنا بڑا سوراخ کرالو جس میں سے میرا سر باہر نکلا رہے۔ کم سے کم سیدھا تو بیٹھوں گا میں۔ لوگ سمجھیں گے کہ چھت پر ایک کٹا ہوا سر رکھا ہے تو سمجھتے رہیں یا تم میری موٹر سائیکل پر..."

"جسے کباڑی بھی نہ لے اسے تم موٹر سائیکل کہتے ہو؟ اسے بیچ کے ایک گدھا خرید لو۔ اس پر بیٹھ کے پھریں گے نا تو ہنسنا جائز لگے گا لوگوں کا۔"

میں نے کہا "گاڑی روک لو یہاں، اسی جگہ۔"

اس نے پریشان ہو کے مجھے دیکھا "تم برا مان گئے؟"

"نہیں۔ آج لنچ ہم یہاں کریں گے۔ کیا ظالم کڑاہی گوشت بناتا ہے ظالم کا بچہ۔ دل چاہتا ہے پانچوں گھی میں ہوں اور سر کڑاہی میں۔"

اوپر فیملی والے حصے میں جا کے صائمہ کے چہرے سے ناگواری کے اثرات ختم ہوگئے۔ "آس پاس تو سب ایسے ہی لوگ ہیں۔ رکشے والے اور ٹیکسی ڈرائیور مگر یہ جگہ شریفانہ ہے۔"

میں نے کہا "رکشے والے اور ٹیکسی ڈرائیور بھی اتنے ہی شریف ہوتے ہیں جتنے ڈاکٹر یا صحافی مثلاً میں..."

"تمہاری شرافت کو میں جانتی ہوں اچھی طرح۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام کے کہا "صائمہ۔ مجھے آج تم سے کچھ کہنا ہے اور وہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔ انتہائی حساس نوعیت کا۔ اس پر میرے مستقبل کا اور میری زندگی یا موت کا انحصار ہے۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑالیا "ڈائیلاگ مت مارو اور خیال رکھو کہ ہم ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں۔"

"ایک بھوکے آدمی کا دل بے رخی سے مت توڑو۔ تمہیں کیا پتا آج میں کیا کہنے والا ہوں۔ میرے جذبات کیا ہیں؟"

"مجھے سب معلوم ہے۔ تم پھر پروپوز کرو گے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ جب ایک بار میں نے کہہ دیا کہ تم سے شادی کرنی ہے اور تم نے بھی مان لیا تو پروپوز کرنا کیسا..... بار بار..."

اس نے کچھ خفت سے ادھر ادھر دیکھا "پھر کیا بات ہے؟"

میں نے اسے بتادیا "رات آٹھ بجے میں جارہا ہوں۔"

اس کا موڈ اتنا خراب ہوا کہ اس نے کھانا چھوڑ دیا "یہ تم کس سے کہا۔

ایک عورت کو زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا۔ اس کے ساتھ آنے والے نے نرس کو بتایا کہ یہ خاتون بڑی عجلت میں ایک دکان سے نکلتے ہوئے ایک ایسے شخص سے ٹکرا گئی تھیں جس نے بہت بڑا کلاک اٹھا رکھا تھا۔

"احمق کہیں کا" نرس نے کہا "وہ شخص دوسرے لوگوں کی طرح وقت دیکھنے کے لیے کلائی کی گھڑی استعمال کیوں نہیں کرتا؟"

چکر میں پڑ گئے ہو صحافت چھوڑ کے۔"

میں نے ایک آہ بھری "صحافت میں کیا رکھا ہے خاتون۔ کام ۔۔نا چٹخارہے ہیں اور بس۔ ایک موٹر سائیکل ہے' وہ بھی چلتی کم پاگل چلاتی زیادہ ہے اور تم کو اس کی سواری پر شرم آتی ہے۔ مالک ۔ان گردن دبوچ کے کرایہ وصول کرتا ہے۔ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے للو!" میں نے امیتابھ بچن کا مشہور ڈائیلاگ دہرایا۔

"تو پھر پیسہ کمانے کے لیے ہیروئن اسمگل کرو۔ چوریاں کرو' ڈاکے ڈالو۔ دوست تو بہت بنا لیے ہیں تم نے۔ کسی بھی گروہ میں شامل ہو سکتے ہو۔ جو عزت کمائی ہے اسے نیلام کردو۔"

میں نے کہا "چلاّؤ مت۔ عزت جیسی چیز کی بولی نیلام میں بھی کوئی نہیں لگاتا۔ عزت ہے ان کی جو پجارو اور لینڈ کروزر میں گھومتے ہیں۔ دو ہزار گز کے بنگلے میں رہتے ہیں۔"

"مجھے شرم آتی ہے جب تم ایسی باتیں کرتے ہو۔"

"کیوں؟ اس کی ذمّے دار کیا تم نہیں ہو؟" میں نے بگڑ کے کہا "تم نے ہی پھڈا کیا کہ پہلے مکان بناؤ۔ جس آدمی کے پاس اپنا گھر نہ ہو وہ گھر بسانے کا سوچتا ہے تو انو کا پٹھا ہے۔ تم میرے ساتھ کرائے کے فلیٹ میں جانے کے لیے تیار نہیں۔ ایک غریب صحافی عشق تک نہیں کر سکتا۔"

وہ رونے کے قریب ہو گئی "خدا کے لیے... آہستہ بولو۔ میں نے ایسا تو نہیں کہا تھا۔"

"اب ڈائیلاگ مت مارنا کہ میں تمہارے ساتھ جھونپڑی میں بھی خوش رہ سکتی ہوں۔ روکھی سوکھی کھا کے گزارا کر سکتی ہوں۔ سچی خوشی تو سچّے پیار میں ہے۔ تمہارا ساتھ ہو تو مجھے جہنم بھی قبول..... یہ سب بکواس ہے۔ اب میں پیسہ کما رہا ہوں جان کی بازی لگا کے' اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کے۔ میں رشوت نہیں لے رہا ہوں۔ یہ حرام کی کمائی نہیں ہے۔ خون پسینے کی کمائی ہے۔ اس میں پسینہ بھی بہتا ہے اور خون بھی بہہ سکتا ہے... کوٹھی اور کار چاہیے نا تمہیں...."

"پلیز.... مت کرو ایسی باتیں!" وہ رونے لگی "چھوڑ دو یہ کام۔ انکار کردو۔ مت جاؤ اسلام آباد۔"

میں نے ایک آہ بھری اور پھر ہنس پڑا "ابھی ویٹر آ جائے گا تو سمجھے گا کہ میں شوہر ہوں تمہارا۔ کتنی بے عزتی کی بات ہو گی میرے لیے.... رہا اسلام آباد نہ جانے کا سوال تو جواب اس کا یہ ہے مس داہمہ...."

وہ روتے روتے مسکرانے لگی "پھر واہمہ کہا مجھے؟"

"یہ سب کا واہمہ لگتا ہے مجھے۔ تم' تمہارا یہ حسن' تمہاری محبت سب واہمہ محسوس ہوتی ہے مجھے۔ حقیقت اتنی خوب صورت نہیں ہو سکتی۔ کسی حسین خواب...."

"اب شروع کر دی نا تم نے لفاظی۔ سچ بتاؤ تم انکار کیوں نہیں کر سکتے؟" اس نے ایک ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کر کے کہا۔

میں نے کہا "سویٹ ہارٹ۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ چکرا چانک کیسے شروع ہو گیا۔ اس میں میری کوشش کا بھلا کیا دخل ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلے کراچی میں یہ ہوا کہ پولیس نے کہیں ڈاکوؤں کو محصور کر لیا۔ ڈاکو اندر تھے اور انہوں نے اہلِ خانہ کو جان سے مار دینے کی دھمکی دی تھی چنانچہ پولیس بھی محاصرہ کیے منتظر تھی کہ دیکھیں اب افسرانِ بالا کیا طے کرتے ہیں۔ ڈاکوؤں سے مذاکرات شروع ہوئے تو انہوں نے ایک شرط عائد کر دی کہ وہ ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہیں مگر مشہور روزنامے کے کرائم رپورٹر نجیب کی موجودگی میں خود کو پولیس کے حوالے کریں گے۔ دراصل انہیں ڈر تھا کہ کسی اور کے سامنے ہتھیار ڈالے تو پولیس انہیں ہلاک کر دے گی اور اسے پولیس مقابلہ ظاہر کیا جائے گا۔ انہوں نے اسے پریس میں پبلسٹی دی اور ایک ایسے صحافی کو چشم دید گواہ بنا لیا جس کی گواہی معتبر تھی اور پولیس جھٹلا نہیں سکتی۔ روزنامے کا کرائم رپورٹر گیا اور ڈاکوؤں نے اس کے سامنے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ انہیں ایک صحافی کے سوا کسی پر بھی اعتبار نہیں تھا۔ ظاہر ہے نجیب نے گھر والوں کی جان بھی بچائی اور ڈاکوؤں کے خلاف بھی غیر قانونی کارروائی نہیں ہونے دی۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کے اس نے یہ کام کیا مگر اپنی خوشی سے نہیں' وہ مجبور تھا۔ اپنے فرض سے بھی اور دونوں طرف کے دباؤ سے بھی۔ ایک طرف پولیس کا مقابلہ تھا کہ چلو' دوسری طرف ڈاکوؤں کا خوف تھا۔ وہ انکار کر دیتا اور پولیس انہیں مار ڈالتی تو ڈاکوؤں کے ساتھی نجیب کے دشمن ہو جاتے۔ جو یہ کہے کہ نجیب نے پبلسٹی کے لیے ڈاکوؤں سے ایسا کہلوایا یا وہ خود بھی انہی کا ساتھی تھا' وہ پاگل خانے جانے کا مستحق۔ یہ خاصی پرانی بات ہے۔ شاید دو سال ہو گئے۔ جب اس واقعے کی شہرت ہوئی تو غالباً بہت سے ڈاکوؤں نے سوچا ہو گا کہ صحافی ایک کار آمد ذریعہ بن سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہیں اور بھی یہ ڈراما ہوا ہو۔ میرے ساتھ ایک واقعہ سال بھر پہلے کا ہے۔ ایک صنعت کار کا اکلوتا بیٹا اغوا ہو گیا تھا۔ ڈاکوؤں نے میرا نام لے کر کہا کہ وہ تاوان کی رقم ساتھ لائے تو سودا ہو سکتا ہے۔ گھر والے چاہتے تھے کہ پولیس بیچ میں نہ پڑے۔ پولیس مجھے پٹی پڑھانے میں لگی رہی کہ میں انہیں کیسے چکما دے کر گرفتار کروا سکتا ہوں اور یہ میرا قانونی' اخلاقی فرض ہے کہ میں پولیس کی مدد کروں وغیرہ وغیرہ۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ سوری' پولیس کچھ کر سکتی ہے تو خود کرے۔ بڑے بڑے افسران نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ صنعت کار کے بیٹے کو کچھ بھی نہیں ہو گا اور پولیس میری حفاظت کرے گی مگر میں نے کہا کہ بکواس' حفاظت تو صدر کینیڈی اور جنرل ضیاء الحق کی نہیں کر سکے' سیکیورٹی کا ڈراما کرنے والے۔ صنعت کار کا ایک ہی بیٹا ہے۔ وہ مارا گیا تو پولیس کا کیا جائے گا؟ نتیجہ یہ کہ مطلوبہ تاوان کی رقم مجھے فیملی نے فراہم کی۔ میں یہ رقم لے کر نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھرا۔ ایک بار انہوں نے ہوٹل میں بلایا۔

وہاں پیغام ملا کہ فلاں پیٹرول پمپ پر آجاؤ۔ پیٹرول پمپ پہنچا تو کہا مری روڈ پر چلتے جاؤ۔ بائیسویں کلو میٹر کے نشان پر نظر رکھو۔ سنگِ میل پر نئی ہدایات رکھی ہوئی ہیں۔ ڈاکو مجھے دیکھ رہے ہوں گے۔ جب انہیں میری نیک نیتی کا اعتبار آگیا تو نویں جگہ مجھے رقم گرا کے ناک کی سیدھ میں ساڑھے تین کلو میٹر جانے کا حکم دیا گیا۔ وہاں وہ لڑکا ننگے پاؤں خستہ حال اور لنگڑاتا ہوا سڑک پر پیدل مری کی طرف جارہا تھا۔ میں اسے گاڑی میں بٹھا کے گھر لے گیا۔ اس صنعت کار نے مجھے ایک لاکھ روپے انعام میں دینے پر بہت اصرار کیا مگر میں نے صاف انکار کردیا کہ یہ تو میرا اخلاقی اور انسانی فرض تھا۔ اب اندازہ کرو ان لوگوں کی معلومات کتنی اَپ ٹو ڈیٹ ہوتی ہیں۔ ڈاکوؤں کو میری اور اعلیٰ پولیس حکام کی گفتگو‘ ان کے اصرار اور میرے انکار‘ ہر بات کا علم تھا۔ دراصل خود پولیس میں ان کے مخبر بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکو انہیں بھی حصہ پہنچاتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ پولیس کیا کارروائی کرنے کا سوچ رہی ہے۔ انہیں یہ بھی پتا چل گیا کہ میں نے ایک لاکھ انعام میں لینے سے انکار کردیا تھا۔ دوسرے یا تیسرے دن مجھے فلیٹ میں ایک لفافہ ملا جو دروازے کے نیچے سے اندر ڈالا گیا تھا۔ اس میں دو لاکھ روپے تھے جو ڈاکوؤں نے شکریے کے ساتھ بھیجے تھے اور بڑی نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا کہ انشاء اللہ ہمارے درمیان یہ تعاون کا مخلصانہ جذبۂ دوستی مزید فروغ پائے گا۔“

”اس کے بعد تمہارے دل میں لالچ پیدا ہوگیا؟“

”لاحول ولا قوۃ۔ لالچ ہوتا تو میں ایک لاکھ ایسے چھوڑ دیتا۔ بے شک مجھے بعد میں افسوس ہوا تھا کہ مجھے جذباتی ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے اتنی محنت کی تھی۔ اتنی خواری برداشت کی تھی۔ وہ میرا حقِ محنت تھا مگر صبر کا پھل میٹھا۔ ڈاکوؤں نے کسر پوری کردی۔ حالانکہ ایسی شرافت اور ایمانداری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا مگر اب کچھ ایسا ہی ہے عزیزہ‘ ڈاکو اور چور شریف ہیں۔ شریف کہلانے والے ڈاکو۔ وہ لوگ بعد میں گرفتار ہوگئے‘ کسی اور کیس میں۔ میں ان سے ملنے جیل گیا اور ان کے لیے وکیل کا بندوبست کیا۔ انہوں نے وکیل کو منہ مانگا معاوضہ دیا اور وکیل نے ان کی ایسی پیروی کی کہ انہیں صرف تین سال کی جیل ہوئی۔ جیل میں ان کی برادری کے ہم پیشہ لوگ بھی تھے۔ انہوں نے یقیناً میری تعریف کی ہوگی کہ اچھا بندہ ہے۔ بھروسے کے قابل۔ پولیس کو سب خبریں پہنچ جاتی تھیں کہ میں ڈاکوؤں کا مشیر بنا ہوا ہوں۔ مجھے ایک ایس پی نے بلا کے بہت ڈانٹا ڈپٹا کہ یہ اعانتِ مجرمانہ ہے۔ میں تمہیں بھی بند کرادوں گا انہی کے ساتھ مگر یہ گیدڑ بھبکی تھی۔ میں کوئی کام خلافِ قانون نہیں کررہا تھا۔ پولیس کے ذریعے اور وکیلوں کی زبانی بات اور پھیلی۔ اب یہ ایک ایسی تکڈم ہے پولیس‘ ڈاکو اور وکیل کی۔ جن کا ایک دوسرے سے وہی تعلق ہے جو ایک مثلث کے تین اضلاع کا ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ یوں میری گڈول پھیل گئی اور اگلے چھ ماہ میں مجھے اسی قسم کے دو کام اور کرنے پڑے۔ میں انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ڈاکوؤں نے مجھے یہ بات بھی سمجھادی تھی کہ میں نے انکار کیا تو وہ مجھے منانے کے لیے خود آئیں گے اور ان کے پاس منانے کے بڑے مؤثر طریقے ہیں۔ پولیس نے پھر مجھے ڈرایا‘ دھمکایا مگر وہ سب ڈراما تھا۔ نیچے کے ایک اہلکار نے کہا کہ ”سر جی! ٹافٹ مُک مکا کرو‘ عید قریب ہے۔ ہمیں بھی حصہ مل جائے گا تو بچے دعائیں دیں گے کہ نئے کپڑے بن گئے۔ افسران بھی راضی رہیں گے ورنہ چالانوں سے عیدی پوری کرنی پڑے گی۔ پھر آپ ہمارے خلاف کالم لکھوگے‘ کیا فائدہ۔ پہلے کچھ ہوا ہے‘ جواب ہوگا۔“ اس نے تو مجھے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ اب میں اسی کاروبار پر زیادہ توجہ دوں۔ صحافت میں کھجل خوار ہونے سے کیا ملا ہے اب تک۔“

”اور تم نے اس کی بات مان لی۔ کمیشن کی بنیاد پر کام کرنے لگے؟“

میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا ”یہ جگہ کچھ مناسب نہیں ہے ورنہ میں آپ کے رخِ روشن پر ایک جھانپڑ رسید کرتا۔ کمیشن کا چکر ظالم خان نے چلایا تھا بلکہ اس سے بھی پہلے ایک سنار تھے۔ اس کی دکان پر ڈاکا پڑا اور ڈاکو تقریباً چالیس لاکھ کے زیورات لے گئے۔ مجھے پیغام ملا کہ سنار سے بات کرو۔ وہ ہم سے سودا کرلے تو زیورات اسے پچیس فیصد پر واپس کردیں گے۔ وہ پہلے تو نہیں مانا۔ اسے پولیس پر بڑا مان تھا۔ بڑے بڑے افسروں کی بیگمات اس کی مستقل گاہک تھیں۔ بیگمات نے کہا کہ ہمارے میاں تو یوں پکڑلیں گے انہیں چٹکی بجاتے ہیں۔ مرد جب ناقص العقل عورت ذات کی باتوں میں آجائے تو سمجھو مارا گیا۔ اپنے باوا آدمؑ کی طرح۔“

صائمہ اس دلچسپ کہانی میں اتنی مگن تھی کہ اس نے رسماً کہا ”فضول باتیں مت کرو۔“

”ڈاکوؤں نے زیور کو ٹھکانے لگادیا ہوگا کہیں۔ خود سنار اُن سے چوری کا مال آدھی قیمت پر خرید لیتے ہیں۔ فائدے میں ڈاکو رہے یا پولیس کے وہ لوگ جن کو ”بلیک شیپ“ یعنی کالی بھیڑ کہا جاتا ہے۔ پتا نہیں سفید بھیڑ کیوں نہیں کہتے۔ بھیڑیں تو سفید ہی ہوتی ہیں سب۔ وہ سنار دو ہفتے بعد روتا پیٹتا میرے پاس آیا مگر اس وقت کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے کہا کہ میرے پاس ڈاکوؤں کا فون نمبر یا فیکس نمبر نہیں ہے۔ وہ خود رابطہ کرتے ہیں چنانچہ صبرِ جمیل اختیار کر اور انتظار کر مگر اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا مال مارکیٹ میں کہاں کہاں پہنچادیا گیا ہے۔ اس سے بڑا بے وقوف کون ہوگا کہ دس لاکھ کے بجائے اپنا چالیس لاکھ کا نقصان کیا۔ اس عبرت ناک مثال کے چند ہفتے بعد دوسرا ڈاکا پڑا تو مجھے افسر رابطہ بننا پڑا۔ درمیان میں ڈاکے تو سیکڑوں پڑے ہوں گے مگر میں اپنے تجربے کی بات کررہا ہوں۔ دوسرے سنار نے کہا کہ جناب‘ سب کا بزنس ہے۔ ڈاکوؤں کا اپنا‘ آپ کا اپنا اور ہمارا اپنا۔ تو دھندے کی بات

کرنے کے لیے کوئی اصول بھی ہونا چاہیے۔ آپ جتنے کم کرادو گے اس کا دس فیصد آپ کا۔ ڈاکو ایک چوتھائی مانگ رہے تھے جو پندرہ لاکھ بنتے تھے۔ میرے کہنے سے دس پر راضی ہو گئے۔ پانچ لاکھ سنار کے بچے تو اس نے ایمانداری سے مجھے پچاس ہزار پیش کر دیے۔"

"اور ڈاکوؤں نے کیا دیا؟" صائمہ طنز سے بولی۔

"ڈاکو بادشاہ لوگ ہوتے ہیں۔ فارسی بولوں گا تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی کہ کبھی سلام پر خفا ہو جاتے ہیں تو کبھی گالی پر خلعت عطا کر دیتے ہیں۔ میں تو کوئی توقع نہیں رکھتا تھا مگر ایک لاکھ نہیں تو پچاس ہزار ضرور مل جاتے تھے خاموشی سے.... خاموشی کا مطلب یہ کہ انکم ٹیکس والوں کے باپ کو بھی پتا نہیں چل سکتا تھا اس آمدنی کا۔"

صائمہ نے بیگ میں سے اپنا پاکٹ سائز کیلکولیٹر نکالا "ذرا ذہن پر زور دے کر یاد کرو۔ کہاں کہاں سے کتنا ملا۔ یہ تو لاکھوں ہوں گے۔"

میں نے چڑ کے کہا "ہو گئے.... پھر؟"

"پھر یہ کہ وہ لاکھوں آخر کہاں گئے؟" صائمہ نے میز پر ہاتھ مارا "تم پھرتے ہو اس مشین پر جس کے دو پہیے ہیں۔ کرایہ نہیں دیتے فلیٹ کا۔"

ویٹر دوڑا دوڑا آیا "آپ نے بلایا سر؟"

میں نے سکون سے کہا "بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔ بل لاؤ۔"

صائمہ نے اسے سو کے دو نوٹ دیے تو میں نے کہا "مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ میری جیب میں پورے تیرہ ہزار ہیں۔"

وہ جل کے بولی "وہ رکھے ہوں گے ان جواریوں کے لیے۔ تمہارے گھر میں بیٹھ کے جوا کھیلتے ہیں اور سب ٹھگ کے لے جاتے ہیں۔ دوست بھی کہتے ہیں خود کو تمہارا۔"

"تمہارے دماغ میں میرے خلاف یہ زہر بھرنے والا ظالم خان کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا" میں نے کہا۔

"کیوں؟ میں کیا یہ.... سیدھا سا حساب نہیں سمجھ سکتی کہ لاکھوں آئے تو کہاں گئے۔ حرام کے مال کا یہی تو ہے.... حرام جاتا ہے۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "اتنی دیر سے بولتے بولتے میرا گلا بیٹھ گیا بلکہ لیٹ گیا۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ مال میں کتنی محنت سے اور جان ہتھیلی پر رکھ کے کماتا ہوں.... تم ابھی سے ایک جاہل احمق اور لڑاکا بیوی بن کے مجھ پر مسلط ہو رہی ہو.... میرے دوستوں کی دشمن ہو گئی ہو۔"

"میں سمجھا رہی ہوں تمہیں۔"

"تم مجھے میری آزادی سے محروم کر رہی ہو" میں نے دھاڑ کے کہا "میرا پیسہ ہے۔ میں جیسے چاہوں خرچ کروں۔ راہِ خدا میں دوں یا جوا کھیل کے لٹا دوں۔ تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی۔"

"میں بتاؤں گی تمہیں" وہ غصے میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"کیا کرو گی؟ زہر کا انجکشن لگا دو گی سب کو۔ پوسٹ مارٹم کرا دو گی پھر؟ یا میرا دل بدل دو گی" میں اس کے پیچھے لپکا "سب کر سکتی ہو تم مگر میرا یہ دل نہیں بدل سکتیں ڈاکٹر صائمہ کیونکہ یہ دل تمہارا ہے' دل تو پاگل ہے...."

ویٹر نے دروازہ کھول کے دانت نکالے "بڑا اچھا فلم ہے صاب.... مادھوری ڈکشٹ اور کرشمہ کپور.... وئی لوشے...."

○☆○

، اسلام آباد تک فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہوئے میری رائے اپنی قومی ائرلائن کے بارے میں خاصی بدل گئی۔ یہ بڑے لوگوں کے لیے بڑی اچھی ہے۔ ورنہ ماشاء اللہ' خیر.... جہاں وی آئی پی صرف دولت مند ہوں وہاں ایسا ہوتا ہے۔

میرے ساتھ والی سیٹ پر بقراط بیٹھا ہوا تھا جو صورت سے سقراط لگتا تھا جس نے زہر کا پیالہ پی لیا ہو۔ وہ بڑی اذیت میں مبتلا نظر آتا تھا۔ یہ غالباً اس خوفناک کتاب کا اثر تھا جو وہ پڑھ رہا تھا اور اس کا موضوع بھی کچھ ایسا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا کی معیشت کے تاریخی ارتقا کا معروضی جائزہ یا کچھ اسی قسم کا دہشت زدہ کرنے والا موضوع تھا۔

کافی پینے کے بعد اسے افاقہ ہوا اور وہ مسکرانے بھی لگا۔ پھر میں نے اس سے خانس آرٹ گیلری اور خیال آگاہی کے بارے میں پوچھا کیونکہ وہ اسلام آباد ہی میں رہتا تھا اور ظاہر ہے اتنا قابل تھا کہ میں نے مرعوب ہو کے اسے بقراط کا خطاب دیا اور اس کی معلومات کی وسعت پر اش اش کرتا رہا۔ غالباً وہ دنیا کے ہر موضوع پر اسی طرح علم کا دریا بہا سکتا تھا۔

خانس آرٹ گیلری قائم کرنے والا کوئی انجینئر تھا۔ اے' کے خان آفریدی' وہ الیکٹرانکس میں ماہر تھا مگر.... اسے فنِ تعمیر سے بھی بہت دلچسپی تھی اور بعد میں اسے جو شہرت ملی' وہ ماہرِ تعمیرات کی حیثیت سے ملی۔ اس نے یہاں کمپیوٹر سوفٹ ویئر اور مائکروچپس پر کام کرنے کی کوشش کی مگر سرکاری رویہ حوصلہ شکن ہی رہا۔ بیوروکریسی کے سرخ فیتے سے گھبرا کے وہ باہر چلا گیا اور خاصا کامیاب بھی رہا۔ اس نے بہت پیسہ کمایا اور لندن' پیرس میں بہت سی عمارات ڈیزائن کیں۔ چالیس سال کی عمر تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ وطن لوٹ کے آیا تو اس نے اپنا گھر راولپنڈی کے مضافات میں بنایا جو اس کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ سائنس اور فن کا خوب صورت اور دلچسپ امتزاج۔ اس کا ڈیزائن انوکھا اور حیرت انگیز تھا۔ لوگ اسے دیکھتے ہی دم بخود رہ جاتے تھے۔ رہی سہی کسر اس نے آرائش میں پوری کر دی اور دنیا بھر سے آرٹ کے نمونے اکٹھے کر کے اس میں سجا دیے۔ ان میں مصوری کے شاہکار بھی تھے اور مجسمہ سازی کے بھی۔ الیکٹرانک انجینئرنگ کا کمال یہ تھا کہ اس گھر کے دروازے کھلے رہتے تھے۔ اس کے اور چند نوکروں کے سوا نہ کوئی باہر جا سکتا تھا اور نہ اندر

آسکتا تھا۔ اس کمپیوٹرائزڈ حفاظتی نظام کو اسکینر اور کلوز سرکٹ ٹی وی سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔ اس نے اپنی اور نوکروں کی تصویر اس سسٹم میں ڈال دی تھی چنانچہ کمپیوٹر صاحب جسے پہچانتے تھے اسے کچھ نہیں کہتے تھے ورنہ حکم صادر فرماتے تھے کہ پکڑلو اس اجنبی کو اور بغیر آواز کئے دروازے آپس میں مل جاتے تھے اور دیوار کا حصہ بن جاتے تھے۔ بلا اجازت قدم رنجہ فرمانے والا ایک مختصر سے کمرے میں قید ہوجاتا تھا جس میں نہ روشنی کا گزر تھا اور نہ ہوا کا۔ لیکن ایک کیمرے کی آنکھ اس کی تصویر اندر کسی مانیٹر پر فراہم کردیتی تھی اور ضرورت ہو تو پرنٹ بھی نکل آتا تھا۔ صاحب خانہ کے سوا اس قیدی کو کوئی نہیں چھڑا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بہت کچھ تھا۔ چھت حسب ضرورت اونچی یا نیچی ہوجاتی تھی۔ فولڈ ہوکے غائب بھی ہوجاتی تھی اور کمرے میں بیٹھ کے تاروں بھرے کھلے آسمان کا یا چاندنی کا لطف اٹھایا جاسکتا تھا۔ دیواریں بھی آگے پیچھے ہوجاتی تھیں اور یہ سب بس ایک اشارے پر ہوتا تھا۔ کسی بھاری بھرکم مشین کا لیور کھینچنے یا ہینڈل گھمانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ کمپیوٹرائزڈ نظام اس کی آواز پر کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا جو عام نظر آتا ہے مثلاً خود کار لائٹس کا نظام۔ اندر باہر کی سب لائٹس خود جلتی بجھتی تھیں۔ جس گوشے میں معمولی سی کمی ہو وہاں لائٹ جل اٹھتی تھی۔ باتھ روم میں خود کار شاور اور نلکے تھے اور پتا نہیں کیسے کیسے الارم تھے اور ٹریپ تھے۔ یہ سب خود اسی نے ڈیزائن کئے تھے۔ یہ اس کا شوق تھا۔ وہ کہیں جاتا تھا تب بھی ہر چیز کو اسی طرح کھلا چھوڑ جاتا تھا۔ کئی چور اور کچھ مہمان بے خبری میں پکڑے گئے۔ چوروں کو پولیس لے گئی اور مہمانوں سے خود اس نے معذرت کرلی۔ جب اس کی شہرت ہوئی تو یہاں اور لوگ بھی متوجہ ہوئے۔ اس نے اسلام آباد میں بہت سے ایسے ہی گھر ڈیزائن کئے۔ ویسے سب کا نقشہ الگ تھا لیکن دوسرے سسٹم وہ صاحبِ خانہ کی ضرورت اور فرمائش کے مطابق فراہم کردیتا تھا۔ کچھ سفارت خانوں نے اس کی خدمات حاصل کیں اور کچھ بینکوں نے۔ وہ کروڑپتی آدمی تھا۔ اسے پیسے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سارے کام وہ بلا معاوضہ صرف اپنے شوق کی خاطر کرتا رہا۔ اس طرح اس کے بہت دوست بن گئے جو انتہائی اثر رسوخ والے لوگ تھے۔ ساتھ ساتھ وہ آرٹ کے نمونے حاصل کرتا رہا۔ وہ لندن، پیرس اور نیویارک جاکے آرٹ کی نیلامی میں شریک ہوتا تھا۔ دراصل آرٹ خود ایک سرمایہ کاری ہے۔ ان کی قیمت بھی جائداد کی طرح بڑھتی رہتی ہے پھر آرٹ کی مارکیٹ لامحدود ہے۔ ساری دنیا کے خریدار جانتے ہیں کہ کس نیلامی میں کون سا شاہکار کس نے خریدا تھا اور اب کہاں ہے۔ کچھ لوگ تو نیلام سے لاکھوں کی تصویریں خریدنے کے بعد اسے گھر بھی نہیں لاتے، کسی آرٹ گیلری کے حوالے کردیتے ہیں۔ اس کی پوری انشورنس ہوتی ہے۔ ایک مصوری کا شاہکار اگر پیرس کی آرٹ گیلری میں موجود ہے تو اسے آسٹریلیا کا خریدار ٹوکیو کے نیلام میں بولی لگا کے خرید سکتا ہے۔ وہاں صرف قیمت ادا کی جاتی ہے اور ملکیت تبدیل ہوجاتی ہے۔ یہ بلیک منی کو چھپانے کا سب سے مؤثر طریقہ ہے۔ کسی کو پتا نہیں چل سکتا کہ کتنے لاکھ یا کتنے کروڑ ڈالر مالیت کی تصویریں آپ کی ہیں مگر آپ جب چاہیں اسے فروخت کرکے رقم آپ کے سوئزرلینڈ کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرائی جاسکتی ہے۔ اے، کے خان کا یہی شوق اس کا بزنس بھی تھا۔ سنا ہے پاکستان میں کوئی اور بھی تھا جس کے پاس اے، کے خان سے زیادہ دولت تھی۔ خان کروڑپتی تھا تو وہ ارب پتی۔ اس کے بھی ایسے ہی شوق تھے۔ کاریں، عورتیں، شراب، خوشبو اور آرٹ کے نمونے جمع کرنا۔ ان کی قیمت کی انتہا کوئی نہیں ہوتی۔ کسی نیلام میں دونوں کا مقابلہ ہوگیا۔ بالآخر ارب پتی جیت گیا مگر بعد میں اسے پتا چلا کہ حریف بھی ایک پاکستانی تھا اور اسے اے، کے خان کے بارے میں بتایا گیا تو وہ بہت متاثر ہوا۔ اس نے مصوری کا وہ شاہکار اے، کے خان کو تحفے میں پیش کردیا۔ یہ دوسرا شخص بھی خان تھا۔ ارباب تاج بخت خان۔ اس طرح ان کی دوستی پکی ہوگئی اور آخری وقت تک جاری رہی۔ اے، کے خان کا آخری وقت آنے تک۔ اسے پچاس سال کی عمر میں ہیپی ٹائٹس بی جیسا مہلک مرض ہوگیا۔ انجام اسے صاف نظر آنے لگا تو اس نے سوچا کہ اب اس بے حساب دولت کا کیا ہوگا۔ جس کا وارث کوئی نہیں۔ ظاہر ہے سب حکومت کی تحویل میں چلا جائے گا۔ اس کی وہ کوٹھی یا محل جو اس نے راولپنڈی کے مضافات میں بنائی تھی، اب اسلام آباد کا حصہ ہے۔ اس نے وہیں "خانس گیلری" قائم کردی۔ اس کے لیے اے، کے خان نے عمارت کے نقشے میں بھی تبدیلی کی اور پھر دنیا میں جہاں بھی اس کے اثاثے آرٹ کی صورت میں موجود تھے، وہ سب یہاں منگوالیے۔ اپنی زندگی میں ہی اس نے "خانس آرٹ گیلری" کا افتتاح ایک وی وی آئی پی سے کرایا اور اپنے دوست بخت خان کو اس کا نگراں بنادیا۔ وہ اب بورڈ آف گورنرز کا چیئرمین ہے۔ بورڈ میں دو ارکان حکومت کے نامزد کردہ ہیں اور دو بخت خان کی مرضی سے لیے جاتے ہیں مگر وہ عوامی نمائندے ہوتے ہیں۔ اسمبلی یا سینیٹ کے اراکین۔ عام لوگ اس گیلری کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ یہ آرٹ وغیرہ کا شوق خواص تک محدود ہے۔ دو سال ہوئے ہیں ابھی مگر بین الاقوامی طور پر قدرداں اور سرمایہ کاری کرنے والوں کے لیے خانس گیلری ایک معتبر اور بڑا نام ہے۔ پہلا یعنی مرحوم اے، کے خان کمال کا انجینئر، ماہر تعمیرات اور شوقین مزاج تھا۔ کہتے ہیں کہ شادی بھی وہ اسی لیے نہیں کرسکا کہ اسے حسین عورت بھی آرٹ کا ایک نمونہ لگتی تھی جسے فریم کرکے گیلری میں لٹکادیا جائے صرف دیکھنے کے لیے۔ ایسی عورت دنیا میں کون ہوگی۔ دوسرا خان کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف آرٹ ڈیلر تھا۔ اس نے کروڑوں کی مالیت کی تصاویر میں سرمایہ کاری کی تھی اور یہ سرمایہ بڑھتا جارہا

تھا۔ بعد میں اس نے وائٹ گولڈ یعنی ہیروئن کا بزنس شروع کردیا تو یہی آرٹ گیلری اس کے کام آئی۔ شاید ہر آرٹ گیلری کے نام پر ایسا ہی کاروبار ہوتا ہے۔ جتنا بڑا نام اتنا محفوظ کاروبار۔

بقراط کی معلومات پر میں دم بخود بیٹھا تھا "آپ کا مطلب ہے کہ اب خانس آرٹ گیلری بھی غیر قانونی کاروبار کے لیے استعمال ہوتی ہے؟"

"شاید۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔"

"اور آپ کو اتنا علم کیسے ہے؟" میں نے کہا۔

"علم بھی ایک اثاثہ ہے" اس نے مجھے پُرملامت نظروں سے دیکھا۔

میں نے فوراً تائید میں سر ہلایا "اب ذرا مجھے ان خاتون کے بارے میں کچھ علم عطا فرمایئے۔ خیال آگاہی کون ہے' اس کا اصل نام یہی ہے؟"

اس نے مجھے بڑی دکھی نظروں سے دیکھا۔ جیسے اس کو میرے جیسے جاہل سے بھی ایسے سوال کی امید نہیں تھی اور اس نے بلاوجہ ہی اتنا وقت بھینس کے آگے بین بجانے میں ضائع کردیا۔ اچھا تھا وہ اپنی کتاب پڑھتا رہتا۔ ڈیڑھ گھنٹے میں وہ کچھ اور قابل و عالم' لائق فائق ہوجاتا۔ "وہ ایک مشہور مصور ہے۔ اس وقت خانس آرٹ گیلری کی ڈائریکٹر ہے۔ اصل نام تھا فخرالنسا بیگم۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "خوب صورت ہے؟"

اس نے سخت رکھائی سے کہا "خوب صورت عورتیں بہت ہیں دنیا میں لیکن وہ خیال آگاہی نہیں ہیں۔"

میں نے اسے متاثر کرنے کے لیے کہا "میں.... بزدل ہوں۔"

"بہادر ہوتے تو کون سا تیر مار لیتے" وہ بریف کیس اور اتنی ہی بڑی کتاب لے کر اٹھ کھڑا ہوا "مجھے اُترنا ہے۔ اسلام آباد آگیا ہے۔"

میں ہڑبڑا کے اٹھا "آگیا.... ویری گڈ۔ مجھے تو آپ کی باتوں میں پتا ہی نہیں چلا وقت کا اور میں بس نام کا بزدل ہوں۔ بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی میرا نام خاصا طویل ہے۔ اس کا مخفف ہوا بزدل۔ پہلے دلنواز تخلص کرتا تھا۔ روزنامہ "خبرساز" میں کالم لکھتا ہوں جھوٹی باتیں۔ سچے آدمی کے قلم سے۔ اور قطعہ بھی ہفتے میں ایک دوبار۔"

صدمے سے اس کا بُرا حال ہوگیا۔ "خبرساز؟ مائی لارڈ۔ اور تم یہ سب مجھے فخر سے بتا رہے ہو کہ تم اس اخبار سے منسلک ہو؟ شاعر بھی ہو۔"

دروازے سے باہر نکلتے ہوئے میں نے کہا "میرے لیے واقعی بڑے شرم کی بات ہے۔ بس ایک سوال اور جس کا جواب مجھے آج تک کوئی نہیں دے سکا۔ آپ بڑے عالم فاضل لائق فائق شخص ہیں۔ یہ بتایئے کہ انگریز جب سقراط کو SOCRATES کہتے ہیں تو بقراط BOCRATES کیوں نہیں کہتے؟"

پھر میں تیزی سے باہر نکل گیا۔ میرے سوال پر اسے ہارٹ اٹیک بھی ہوسکتا تھا۔

رات ساڑھے دس بجے اسلام آباد ائرپورٹ روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور لاؤنج کے سامنے بہت سے لوگ ہکا بکا کھڑے منہ اٹھائے آنے والوں کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ کسی خلائی سیارے سے اڑن طشتری میں آئے ہوں۔ کسی آشنا چہرے کو دیکھتے ہی ان کی آنکھیں چمکنے لگتی تھیں اور بتیسی نظر آنے لگتی تھی۔ وہ انگلی اٹھا اٹھا کے کسی کو بتاتے تھے۔ وہ....وہ آگیا میرا سسرا.... میرا مطلب ہے تمہارے والد ماجد۔

مجھے وصول کرنے کون آسکتا تھا' اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا مگر پھر مجھے ہجوم میں ایک پلے کارڈ نظر آیا۔ اسی طرح ڈنڈے پر ہارڈ بورڈ لگائے اور اس پر کسی کا نام لکھے بہت سے لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ شخص میرے نام سے کچھ شرمندہ اور ناراض نظر آتا تھا۔ شاید "بزدل" کا نام دیکھ کے کسی نے مذاق میں کچھ کہہ دیا ہوگا اسی لیے وہ سب کے پیچھے تھا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "سوری۔ میں نے تمہیں دیر سے دیکھا۔ دراصل باقی لوگ کھڑے ہوئے تھے اور تم سب کے پیچھے بیٹھ گئے تھے۔"

اس نے بُرا مان کے کہا "میں بھی کھڑا ہوا ہوں جناب مگر اتنی بلندی سے تو آپ کو ایسا ہی لگے گا۔"

میں نے پھر اس پانچ فٹ کے آدمی سے معذرت کی جو میرے ساڑھے چھ فٹ قد سے بھی ناخوش تھا۔ لڑکیوں کے ایک گروپ کی ہنسی شیشے کی طرح چمکتے فرش پر کانچ کی چوڑیوں کے گرنے کی آواز بن کے پھیل گئی "دیکھ لے کم بخت۔ یہ ہے بزدل۔ ارے وہ گولمبو۔ عالم چنا کا چھوٹا بھائی۔ صورت سے بھی بزدل ہی لگتا ہے مگر ہے اسمارٹ۔"

میں نے پلٹ کے دیکھا اور مسکرایا اور شاید میرے قدم بھی بہکے تھے۔ میرے وصول کنندہ نے کوٹ کی آستین پکڑ کے مجھے کھینچا "ادھر آئیے پلیز۔ یہ ہیں اسلام آباد کی لڑکیاں۔" اس نے طنزاً کہا۔

میں نے کہا "اچھا؟ سنا ہے بڑی بزدل ہوتی ہیں۔ خوب گزرے گی پھر تو کیونکہ میں بھی بزدل ہوں۔ ہاہاہا...." ایک مصنوعی قہقہہ لگاتے ہوئے میں نے اس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا۔

پھر میں اس شاہانہ مرسیڈیز میں بیٹھ گیا جو مجھے لانے کے لیے میرے میزبانوں نے بھیجی تھی۔ اس میں بیٹھتے ہوئے میرا سر دروازے کے اوپر نہیں لگا۔ اگر دو چار کیس ایسے ہی مل جائیں تو میں بھی ایسی کار خرید سکتا ہوں جس کی ڈکی میں ڈاکٹر صائمہ کی کار آجائے۔ میں نے سوچا۔ مجھے اب زیادہ ذمے داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ صائمہ کی خفگی بجا تھی۔ لاکھوں کمائے مگر جوئے میں نکل گئے۔ بس آج سے جوا بند۔ میں نے اس کے تصور سے وعدہ کیا۔

اس رات میری ملاقات خیال آگاہی سے نہیں ہوئی۔ ایک

فائیو اسٹار ہوٹل میں میرے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ رات ساڑھے گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجنے لگی اور میں نے خیال آگاہی کی مترنم آواز سنی۔ رسمی علیک سلیک والی کال تھی چنانچہ میں نے بھی بے حد شائستگی سے کام لیا۔

"صبح دس بجے ملاقات ہوگی آپ سے مسٹر زماں!"

میں نے کہا "مس خیال آگاہی۔"

"مسز خیال آگاہی!" اس نے فوراً تصحیح کی۔

مجھے کچھ مایوسی ہوئی "جی۔ میں اسلام آباد کے راستوں سے قطعی ناواقف ہوں۔"

"وہی گاڑی آپ کے ڈسپوزل پر ہے۔ شوفر کے ساتھ۔ جس میں آپ ائرپورٹ سے ہوٹل آئے تھے۔ کوئی اور پرابلم ہو تو آپ اُسے بھی بتا سکتے ہیں۔"

"بھی" کا مطلب غالباً یہ تھا کہ میرے علاوہ۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور سو گیا۔ باہر موسم سرما کی یخ بستہ رات تھی اور پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے اسلام آباد میں بھی راگ پہاڑی گانے والے گیدڑوں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ صبح ساڑھے سات بجے سورج بادلِ ناخواستہ طلوع ہوا مگر دھوپ کہیں نو بجے صاف نظر آنے لگی۔ اس سے پہلے کھڑکی کے شیشوں پر بھی دھند تھی اور باہر کا منظر دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ ناشتے سے پہلے ہی میں اخبار کا مطالعہ کر چکا تھا۔ نو بجے میں نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا۔ سردی سے میرے دانت بج رہے تھے مگر میرے رہنما اور شوفر اس کے عادی معلوم ہوتے تھے اور چمڑے کی ایک جیکٹ پہنے مسکرا بھی رہے تھے۔ لوگ جرسی کے اوپر کوٹ، پھر اوور کوٹ یا ڈفل کوٹ۔ مفلر اور سمور کے دستانے پہنے تھے۔ میں نے صرف ایک ٹراپیکل سوٹ پہن رکھا تھا۔

گاڑی کا ہیٹر آن ہوا تو میری کپکپی ختم ہوئی اور میں نے باقی وقت فیصل مسجد دیکھ کے گزارا پھر شوفر مجھے خانس گیلری لے گیا۔ بقراط نے مجھے اس کے بارے میں اتنا بتا دیا تھا کہ میرا تجسس بڑھ گیا تھا۔ باہر سے عمارت کو دیکھ کر پہلے مایوسی ہوئی۔ اس میں نہ فنِ تعمیر کا حسن تھا اور نہ کوئی ندرت۔ آرٹ گیلری سے زیادہ یہ فوجی اسلحہ خانہ قسم کی بیرک نظر آتی تھی۔ وہ مستطیل عمارات تھیں جن کی شکل انگریزی حرف ایکس جیسی تھی۔ سیمنٹ اور کنکریٹ کی مضبوط دیواروں پر سرمئی سا رنگ تھا اور دروازہ صرف ایک تھا۔ اس جگہ جہاں دائیں بائیں پھیلی ہوئی عمارت کے دونوں بازو ملتے تھے، شاید حفاظت کے خیال سے بیرونی دیواروں کی ساخت بدل دی گئی تھی۔ غیر ضروری کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ باغ البتہ خوب صورت تھا۔ انگریزی حرف ایکس کے درمیان چار تکونے حصے بن گئے تھے۔ ان میں سامنے والا پارکنگ کے لیے مخصوص تھا مگر مجھے کہیں بھی کوئی سیکیورٹی گارڈ تک دکھائی نہ دیا۔ چار عالی شان کاریں اور چند عام سی پرانی کاریں اور موٹر سائیکلیں یہاں میرے علاوہ بھی انسانوں کے وجود کا پتا دیتی تھیں ورنہ ماحول پر عجیب سی پُر آسیب ویرانی کا راج تھا۔

دروازے میرے قریب پہنچتے ہی خود کھل گئے۔ اس کے بڑے بڑے سیاہ شیشے تھے مگر عام دروازوں کی طرح اس میں نہ لاک تھا اور نہ ہینڈل۔ شیشہ بھی ضرور بلٹ پروف قسم کا ہوگا اور اسے چھونے سے نہ جانے کیا ہوتا ہوگا۔ کہیں سیکیورٹی کو مانیٹر کرنے والے کے سامنے سرخ لائٹ جل جاتی ہوگی یا الارم چلانے لگتا ہوگا اور ٹی وی اسکرین پر تصویر آجاتی ہوگی۔ میں نے سوچا، یہ احساس بڑا پریشان کن تھا کہ مجھے خفیہ کیمروں کی آنکھیں مسلسل گھور رہی ہیں اور میری تلاشی لیے بغیر ہی اسکینر دیکھ چکے ہیں کہ میری جیب میں کوئی ریوالور یا توپ نہیں ہے۔

خیال آگاہی کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کے میں بھونچکا رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی دیوار میں سے برآمد ہوئی ہے یا پُراسرار مخلوق کی طرح اس نے نظر آنے کا فیصلہ کیا تو نظر آنے لگی ورنہ وہ INVISIBLE تھی۔ وہ بلاشبہ ایک حسین اور دلکش جسمانی خدّوخال رکھنے والی عورت تھی اور اس کا لباس اور میک اَپ بھی نظر نواز تھا مگر اس نے اپنی شخصیت پر افسوس ناک سنجیدگی کا سخت خول چڑھا رکھا تھا۔ غالباً دست دراز اور زبان دراز مردوں کے معاشرے میں خود کو محفوظ رکھنے کے لیے خیال آگاہی جیسی عورت ایسا کرنے پر مجبور تھی۔

"زماں صاحب!" اس نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا "میں اس گیلری کی ڈائریکٹر ہوں۔ خیال آگاہی، بورڈ آف گورنرز کی میٹنگ اس طرف ہوگی۔ یہ ایڈمنسٹریشن بلاک ہے۔ باقی تین بلاک آرٹ گیلری کے لیے ہیں۔"

جہاں انگریزی حرف ایکس کے چاروں بازو ملتے تھے وہاں ایک گول ہال تھا جس کے وسط میں شیشے کا خاصا اونچا گنبد تھا جو دھوپ سے روشن تھا اور یہ روشنی نیچے بھی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں معلق پیتل کے بھاری فانوس کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ گنبد کا شیشہ بکھر کے فانوس سمیت میرے اوپر آگرے گا۔ خیال آگاہی کے پیچھے میں گول ہال کے چار میں سے ایک دروازے سے گزرا تو ایک دم رات ہوگئی۔ میں پھر بھونچکا رہ گیا۔ وہ عام دروازہ نہیں کوئی بابِ طلسمات تھا کہ جس کے ایک طرف دن ٹھہرا ہوا تھا تو دوسری جانب سیاہ رات کا قیام تھا لیکن یہ سب اے، کے خان مرحوم کا کمالِ فن تھا۔ اس کی روح کو یقیناً میری حیرانی سے خوشی حاصل ہوئی ہوگی۔

میرے سامنے ایک طویل کوریڈور تھا جس میں دونوں جانب بند دروازے تھے اور چھت کی جگہ تاریک آسمان۔ اس میں ستارے بالکل قدرتی انداز میں دمک رہے تھے اور ایک خوابناک سی روشنی پھیلا رہے تھے۔ دیواروں پر کوئی لائٹ یا سوئچ نہیں تھا مگر راستہ کہکشاں کی طرح روشن تھا۔ یہ روشنی شیشے جیسے فرش کے نیچے

سے پھوٹ رہی تھی۔
میں نے تعریفی انداز میں سرہلایا "جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔"
خیال آگاہی کی صورت پر کوئی ردّعمل ظاہر نہیں ہوا۔
"مرحوم اے، کے خان الیکٹرانکس میں ایک جینئس تھے۔" اس نے ایک دروازے کے سامنے رک کر کہا۔
میں نے کہا "میں آپ کی بات کر رہا تھا" اور فوراً دروازے سے اس ہال میں داخل ہو گیا جہاں بورڈ آف گورنرز کے معزز اراکین میرے لیے چشم براہ تھے۔ ہال کے وسط میں طویل میز تھی۔ اس کے آخری حصے گولائی میں تھے۔ میز کی طوالت تیس فٹ سے زیادہ ہی ہوگی۔ اس کے دونوں طرف دس دس کرسیاں تھیں اور آمنے سامنے دو۔ اتنی بڑی میز پر ایک ہی شیشہ تھا جس میں کہیں جوڑ نظر نہیں آتا تھا۔ لائٹس کہیں بھی نہیں تھیں مگر روشنی ہر جگہ سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ میرے لیے وہاں ہر چیز حیران کن ثابت ہو رہی تھی چنانچہ میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا۔
آخری حصے کی ایک کرسی پر بیٹھا ہوا شخص چیئرمین ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے اپنا اور دوسروں کا تعارف کرایا لیکن نہ جانے کیوں وہاں مجھے ان سب کا رویہ بھی مصنوعی اور مشینی سا لگا۔ جیسے وہ انسان نہیں بالکل انسانی مشابہت رکھنے والے روبوٹ ہیں۔ مرحوم اے، کے خان کے فن کار ذہن کے ساتھ الیکٹرانکس میں مہارت کے امتزاج سے وجود میں آنے والے مجسمے جو انسانوں کی طرح مسکرا بھی سکتے ہیں، بات بھی کر سکتے ہیں مگر جذبات نہیں رکھتے۔
تاج بخت خان ان لوگوں میں تھا جو اپنی خود ساختہ سلطنت میں بادشاہ سے کم نہیں ہوتے۔ اس کے بارے میں لوگ بہت کچھ جانتے تھے مثلاً یہ کہ اس کے بحری جہاز چلتے ہیں۔ وہ یورپ کی کسی ائرلائن کا مالک ہے۔ امریکا میں اس کے سپر اسٹورز کی چین ہے اور ہوٹل ہیں۔ پاکستان میں سیمنٹ، کیمیکلز اور ٹیکسٹائل تک ہر صنعتی شعبے میں اس کا حصہ ہے مگر میرا خیال ہے کہ بہت کچھ وہ ہوگا جو کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔ شاید وہ خود بھی زبانی یاد نہیں رکھ سکتا ہوگا کہ اس کا بزنس کہاں کہاں ہے اور کیا کیا ہے۔ اسے سیکریٹری یاد دلاتے ہوں گے کہ حضور والا، آپ آسٹریلیا میں بھیڑوں کی فارم کے مالک بھی ہیں۔ پھر اپنی دولت اور اثاثوں کا حساب وہ کیسے رکھ سکتا تھا۔ یہ کام کمپیوٹرز، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس اور فنانس ڈائریکٹرز کی فوج رکھتی ہوگی۔ وہ مطمئن تھا کہ سب ٹھیک ہے اور دولت صحیح شرح سے بڑھتی جا رہی ہے۔
اس کے نامزد کردہ دو ڈائریکٹرز میں جو ممبر کہلاتے تھے، ایک رکن اسمبلی راجا کرم داد خالص پوٹھوہاری لہجے میں انگریزی بول کے انگریز قوم کے جذبات کو مجروح کرتا تھا۔ وہ بھی تو منہ ٹیڑھا کر کے اکڑی ہوئی زبان سے اردو کی ٹانگ توڑتے رہے تھے اور غالب کا شعر یوں پڑھتے تھے۔ ڈل ناڈاں واٹ از دی میٹرودیو؟ آخر اس ڈرڈ کا ٹریٹمنٹ کیا ہے؟
دوسرا خالص لاہوری لہجے میں پہلوان جی، بادشاہو اور بھاجی کہہ کے مخاطب کرنے کا عادی لسی اور سجّے کی طرح گورا چٹا نوجوان تھا۔ انتہائی مہذب اور بہترین سوٹ ٹائی میں ملبوس چوہدری اللہ دتا لاہور کی ایک معزز کاروباری شخصیت تھا اور اس کی ادب اور آرٹ پر معلومات حیرت انگیز تھیں۔
سرکاری ممبرز بیورو کریسی کے نمائندے تھے۔ انتہائی دولت مند راجا کرم داد اور چوہدری اللہ دتا کے مقابلے میں احساس کمتری کو مٹانے کے لیے وہ اپنے اختیارات کی طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس کا اظہار ان کے رویے سے بھی ہوتا تھا۔ اوصاف علی ہائی کورٹ کا جج تھا چنانچہ باقی سب کو ایسے دیکھتا تھا جیسے وہ سب مبینہ ملزم ہیں جو خورد برد کی واردات کر چکے ہیں یا کرنے والے ہیں۔ تیسرا محکمۂ ثقافت کا جوائنٹ سیکریٹری عارضی طور پر سیکریٹری کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اس کا نام غیاث بخش تھا اور جب وہ بات کرتا تھا تو یہ واضح کرنے کے لیے کہ باقی لوگ بھرتی کے ہیں اور ثقافت کا مطلب اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تجارت کا یا عدالت کا وزارتِ ثقافت سے کیا تعلق۔ یہ اور بات ہے کہ معاملہ اس کے الٹ تھا۔ وہ سب سے زیادہ جاہل تھا اور اس کی بات کو وہاں کوئی بھی اہمیت نہیں دیتا تھا۔
فخرالنسا بیگم عرف خیال آگاہی مجھ سے تیس فٹ دور میز کے دوسرے کنارے پر تشریف فرما تھیں۔ وہ ڈائریکٹر کہلاتی تھیں مگر ان کے فرائض انتظامی نوعیت کے تھے۔ منیجر یا ایڈمنسٹریٹر کے عہدے کی وہ شان نہیں ہوتی جو ڈائریکٹر کی حیثیت میں محسوس ہوتی ہے۔ مصور ہونے کی وجہ سے خیال آگاہی وہ سارے کام کر سکتی تھی جو بورڈ آف گورنرز کے پانچوں اراکین مل کے بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔
چیئرمین کے اشارے پر اس نے پڑھنے کے انداز میں ایک لیکچر دیا۔ یہ بریفنگ میرے لیے دلچسپ ہو سکتی تھی اگر مجھے پہلے سے بقراط نے سب باتیں نہ بتائی ہوتیں۔ میں کافی پیتے ہوئے خیال آگاہی کے اعتماد، اس کی آواز، فصاحت و بلاغت اور شخصیت پر زیادہ غور فرماتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ اگر وہ ہلکے رنگ کے بجائے گہرے نیلے، میرون یا سیاہ بلاؤز میں ہوتی اور اس کا گریبان بھی اتنا تنگ نہ ہوتا۔ خیر، اس میں بھی گردن صراحی دار لگتی ہے۔
دس منٹ سے بھی کم وقت میں خانس آرٹ گیلری کی تاریخ اور انتظامی معاملات کو ختم کر کے وہ اصل واردات پر آگئی تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ نیشنل آرٹس کونسل اور وزارتِ ثقافت کے تعاون سے پاکستان کی آزادی کے پچاس سال مکمل ہونے پر اسلام آباد کے بعد چاروں صوبوں میں نمائش کا اہتمام کیا گیا تھا۔ آرٹس اینڈ کرافٹس کی ایک بین الاقوامی نمائش اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ خیال یہ تھا کہ اس کا افتتاح چودہ

اگست کو صدرِ مملکت یا وزیرِ اعظم کریں گے مگر وقت کی کمی کے پیش نظر اسے ۲۵ دسمبر تک ملتوی کر دیا گیا۔ اس بین الاقوامی نمائش میں دوسرے بہت سے ممالک نے شرکت پر آمادگی ظاہر کی تھی مگر بعض یورپی ممالک صرف دسمبر میں ہی شریک ہو سکتے تھے۔ مجموعی طور پر اس میں چھیاسٹھ ممالک سے مصوّری، مجسمہ سازی، دستکاری اور فنونِ لطیفہ کے تقریباً سات سو نمونے موصول ہوئے۔ یورپی اور ایشیائی ممالک کی تعداد سب سے زیادہ تھی مگر افریقہ سے بھی سات ممالک نے چالیس چیزیں اپنے سفارت خانوں کے ذریعے فراہم کردیں۔ ان کی ذمّے داری وزارتِ ثقافت نے قبول کی تھی اور بلاشبہ ان بیش بہا اشیا کے لیے حفاظتی انتظامات بھی قابلِ تعریف تھے۔ ان تمام اشیا کی مکمل انشورنس تھی چنانچہ بین الاقوامی انشورنس کمپنیاں بھی دیوالیا ہونے سے بچنے کے لیے حفاظتی معاملات میں شریک تھیں ورنہ چوری، ڈکیتی یا آگ لگ جانے یا کسی چیز کے ٹوٹ پھوٹ جانے کی صورت میں انہیں کروڑوں ڈالر ادا کرنے پڑتے۔

ایک افریقی ملک سنگانوے کی طرف سے ایک ہی چیز موصول ہوئی تھی۔ یہ ساگوان کی لکڑی کا ڈھائی فٹ لمبا اور دو فٹ چوڑا تختہ سا تھا جس کی موٹائی دو انچ کے قریب تھی لیکن درحقیقت یہ ایک باکس تھا۔ اس کے اوپر بہت نفیس ہاتھی دانت کی جالی تھی جو اس طرح لکڑی کے اوپر دبا کے لگائی گئی تھی کہ لکڑی میں پیوست ہو گئی تھی۔ اس باکس کو کھولنے سے نچلے حصے کے ایک انچ گہرے فریم جیسے حصے کی فنکاری سامنے آتی تھی۔ لکڑی پر پیتل کے ابھرے ہوئے نقوش سے بڑی خوب صورت تصویر بنائی گئی تھی۔ درمیان میں کسی دیوی یا دیوتا کی شبیہ تھی۔ اس کا منہ کوبرا سانپ جیسا، دھڑ عورت کا اور نچلا حصہ مردانہ تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں نیزہ تھا۔ دیوتا کے دائیں جانب شیر سجدے میں پڑا ہوا تھا اور بائیں جانب ہاتھی۔ اس میں سنگانوے کی تاریخ اور تہذیب کے ساتھ ان کے مذہبی عقائد کی عکاسی کی گئی تھی جسے سمجھنا ایک عام آدمی کے لیے بہت مشکل تھا۔

سنگانوے کو ۱۹۷۷ء میں برطانوی تسلط سے آزادی ملی۔ جب تک یہاں برطانوی تھے، اس کا نام ساگالینڈ تھا اور اس کے دو صوبے تھے، جن میں دو قبائل آباد تھے۔ ان کے درمیان جنگوں کی تاریخ سیکڑوں یا ہزاروں سال پرانی تھی اور وہ اس قبائلی دشمنی پر فخر کرتے تھے۔ اس کے بغیر ان کے نزدیک اپنی شناخت قائم رکھنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ دوسرے کا نام تاریخ کے صفحے سے بھی مٹا دے لیکن انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے انہوں نے مشترکہ جنگی حکمتِ عملی اختیار کی اور بالآخر برطانیہ کو ملک چھوڑ کے جانا پڑا۔ دونوں صوبے ایک ہوگئے اور اس کا نیا نام سنگانوے رکھا گیا۔ ایک قومی حکومت بھی قائم ہوئی لیکن ظاہر ہے قدیم تاریخی دشمنی کے باعث بہت جلد ملک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی جو دس سال جاری رہی۔ اس میں دونوں قبیلوں کے ہزاروں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ پھر ایک سپرپاور نے دخل اندازی کی تو دوسری سپرپاور بھی میدان میں آگئی۔ امریکا اور روس دونوں کو نہ قبائل کی جنگ سے دلچسپی تھی اور نہ ان کی ثقافت، سیاست یا عداوت سے۔ دونوں وہاں اپنے اپنے حامیوں کو برسرِاقتدار دیکھنا چاہتے تھے تاکہ سنگانوے میں یورینیم کے ذخائر کی تلاش کی جائے۔ یہ سپرپاورز ایسی ہی جنگ ویت نام میں لڑ چکے تھے جس کا دوسرا مقصد اپنے روایتی ہتھیاروں کی نکاسی تھا۔ جب روس کی حیثیت سپرپاور کی نہیں رہی تو امریکا کو اپنے حلیف قبیلے کی حکومت قائم کرنے کا موقع مل گیا اور مخالف قبیلے کے ارکان یا تو ہزاروں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، روپوش ہوگئے یا بھاگ کے پڑوس کے ممالک زائر میں یا روانڈا میں پناہ گزیں ہوگئے۔ زائر اور روانڈا کی اپنی حالت خشک سالی اور قحط سے خراب تھی۔ تاہم سنگانوے میں امریکی امداد سے عارضی خوش حالی آگئی اور ایک کٹھ پتلی حکومت بھی قائم ہوگئی۔

سرکاری طور پر نمائش میں جو چیز سنگانوے کی حکومت نے بھیجی تھی، وہ سفیر نے حکومت کے حوالے کی تھی۔ ان کے نزدیک یہ انتہائی اہم اور بیش قیمت اس لیے تھی کہ اس کی ایک حیثیت تاریخی تھی۔ ان کے حساب سے یہ چیز گیارہ سو سال قدیم تھی اور نویں صدی کا شاہکار تھی۔ اس کے علاوہ اسے مقدس اور مبارک سمجھا جاتا تھا۔ دونوں قبائل یہ سمجھتے تھے کہ یہ دیوتاؤں کی امانت ہے اور آسمان سے اتری ہے۔ جس کے پاس یہ نقش ہوگا، زمین پر حکمرانی اسی کی ہوگی چنانچہ پچھلے ایک ہزار سال میں یہ پیتل کی تصویر یا نقش حاصل کرنے کی جدوجہد کبھی ختم نہیں ہوئی۔ جو قبیلہ اسے طاقت کے بل پر جنگ جیت کے حاصل کرلیتا تھا، وہ حکمراں ہوجاتا تھا مگر کئی بار ایسا بھی ہوا کہ یہ نقش چرا لیا گیا اور حکمراں قبیلہ حواس باختہ ہوگیا کہ اب دیوتاؤں کا قہر نازل ہوگا اور ان کی حکومت تہس نہس ہوجائے گی۔ خود رعایا کا مورال اتنا گر گیا کہ انہوں نے رضاکارانہ طور پر حکومت کا ساتھ چھوڑ دیا اور فرار ہوگئے۔ نقش حاصل کرنے والا قبیلہ خود بخود برسرِاقتدار آگیا۔

اب اگرچہ عقائد پر سیاست حاوی آگئی ہے مگر لوگ پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ سنگانوے کی حکومت اسی نقش کی برکت سے اقتدار میں ہے۔ دوسرا قبیلہ شکست کھا کے بھاگ جانے کے باوجود اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اب حکومت حاصل کرنے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنگانوے کے سفیر محترم اس نقش کی حفاظت کے خیال سے بہت متفکر اور پریشان تھے مگر خانس آرٹ گیلری کے حفاظتی انتظامات دیکھنے کے بعد انہوں نے یہ تاریخی چیز نمائش میں رکھنے کا خطرہ مول لے لیا۔

نمائش سے ایک ماہ قبل نومبر میں یہ اطلاع ملی کہ سنگانوے کے ایک حصے پر شکست خوردہ قبیلے نے حملہ کرکے قبضہ کرلیا ہے۔

ان کی پشت پناہی کسی افریقی ملک نے ہی کی اور وہ اچانک اکٹھے مسلح ہو کے اندر گھس آئے۔ ملک کا تقریباً ایک تہائی حصہ ان کے کنٹرول میں آگیا اور انہوں نے فوراً ایک خودمختار ملک کے قیام کا اعلان بھی کردیا۔ اس ملک کو انہوں نے کمپوریا کا نام دیا ہے مگر اسے ابھی تک دنیا کے گنے چنے غیر اہم ممالک کے سوا کسی نے بھی تسلیم نہیں کیا ہے۔

دسمبر میں نمائش کے دوران میں یہ مقدس چیز غائب ہوگئی۔ نمائش ایک ہفتے جاری رہی۔ چوری آخری دن یعنی نئے سال کی رات ہوئی۔ ۳۱ دسمبر ۹۷ء اور یکم جنوری ۹۸ء کی درمیانی شب۔ لیکن اس کا پتا صبح اس وقت چلا جب آرٹ گیلری نمائش کے آخری دن پبلک کے لیے کھولی گئی۔ مسز خیال آگاہی نے چیئرمین کو اس واردات کی اطلاع دی۔ وزارتِ ثقافت کے سیکریٹری غیاث بخش نے سیکریٹری وزارتِ خارجہ سے ملاقات کی اور طے یہ پایا کہ فی الحال اس معاملے پر خاموشی اختیار کی جائے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام ایسے تفتیش کریں کہ اس کی خبر پریس کو نہ ہو۔ اس مقدس نقش کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ، سنگانوے کے سیاسی حالات کے پس منظر میں یہ چوری انتہائی سنگین نتائج کی حامل تھی۔ ایک طرف سنگانوے کی حکومت سرکاری سطح پر احتجاج کرتی اور ان کے سفیر صاحب پریس کانفرنس میں حکومت پر بھی اس سیاسی سازش میں شریک ہونے کا الزام لگادیتے جس کا مقصد سنگانوے کے دشمنوں، علیٰحدگی پسند اور دہشت گرد ٹولے کی مدد کرنا تھا جو کمپوریا کی نام نہاد مملکت کو تسلیم کروانا چاہتے ہیں۔ اس مقدس نقش سے محرومی کا مطلب بالآخر اقتدار سے محرومی تھا۔ برسراقتدار حکومت کبھی دلیل یا منطق سے عوام کو قائل نہیں کرسکتی کہ سیاسی معاملات کا دیوتاؤں کی ناراضی یا خوشنودی سے کوئی تعلق نہیں۔ حکومت کے حامی قبیلے کا یہ یقین اٹل ہے کہ مقدس نقش نہ رہے تو دیوتاؤں کا عذاب نازل ہوتا ہے اور دنیا کی کوئی طاقت انہیں اس عذاب سے نہیں بچاسکتی۔ ان کا حوصلہ جواب دے جائے گا اور حکومت کے پاس اقتدار اپنے پاس رکھنے کا کوئی روحانی جواز باقی نہیں رہے گا تو افراتفری پھیلے گی۔ حکومت کے قدم اکھڑ جائیں گے اور ایسے وقت میں اگر کمپوریا کی باغی حکومت یہ مقدس نقش حاصل کرنے میں اور اس کی نمائش کرنے میں کامیاب ہوگئی تو پھر سنگانوے پر ان کا قبضہ ہوجائے گا۔ سنگانوے اس سیاسی انقلاب کے بعد کمپوریا کہلائے گا اور اسے ساری دنیا تسلیم کرلے گی۔

حکومتِ پاکستان کے لیے یہ انتہائی پریشانی اور شرمندگی کی بات ہوتی کہ اس پر سیاسی سازش کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹنے والوں کی مدد کا الزام آئے جب کہ کمپوریا اور سنگانوے جیسے کسی ملک کے ساتھ پاکستان کے نہ سیاسی مفادات وابستہ ہیں اور نہ معاشی مگر سیاست میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے دشمن ممالک بھی ہنگامہ کھڑا کردیتے کہ پاکستان ہر جگہ پنگا لیتا ہے۔ اس نے بھارت میں سکھوں کی علیٰحدگی پسند تحریک کو ہوا دی۔ وہ کشمیر کے شورش پسندوں اور دہشت گردوں کو اسلحہ فراہم کرتا ہے اور وہاں جو حریت پسند بھارتی فوج سے لڑتے ہیں، وہ دراصل پاکستان کے فوجی ہیں۔ پھر پاکستان نے افغانستان کے معاملات میں پوری طرح ٹانگ اڑا رکھی ہے اور آئی ایس آئی نے وہاں جہاد کے نام پر طالبان کو کھڑا کردیا ہے۔ اب اس نے کمپوریا کے باغیوں کی مدد کے لیے مقدس نقش ان تک پہنچادیا ہے تاکہ نئی برسراقتدار آنے والی نئی جمہوریہ کمپوریا اس کی حمایت کے بدلے پاکستان کو یورینیم کے ذخائر تک رسائی فراہم کردے اور پاکستان اپنا ایٹمی پروگرام جاری رکھ سکے۔ اس سے پڑوسی ممالک کی سلامتی خطرے میں پڑجائے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ بھارت کی حکومت کے انتہاپسند حلقے اس قسم کی بے بنیاد الزام تراشی میں مصروف ہیں اور کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ان کی سیاسی دکان داری اسی پر چلتی ہے۔

پاکستان کے لیے عالمی برادری میں اپنی نیک نامی اہم ہے۔ اس مقدس نقش کی بازیابی سنگانوے کی حکومت کی بقا کے لیے اہم ہے اور کمپوریا کی باغی حکومت کے لیے اس کا حصول اہم ہے۔ چوری کی رپورٹ ملتے ہی بین الاقوامی پروازوں کی نگرانی سخت کردی گئی۔ ایف آئی اے کے سینئر حکام بڑی رازداری سے باہر جانے والے تمام مسافروں کا اسباب تفصیل کے ساتھ چیک کررہے تھے۔ سفارتی عملہ اس سے مستثنیٰ ہوتا ہے مگر ان کا سامان بھی ایسے دیکھا گیا کہ انہیں پتا نہ چلے۔ سنگانوے کے سفیر کا اس تمام کارروائی سے بے خبر رہنا عملاً ناممکن تھا۔ انہیں بڑی مشکل سے یقین دلایا گیا کہ یہ چوری ہے جس کا حکومت کے سیاسی مقاصد سے کوئی تعلق نہیں اور حکومت پوری نیک نیتی کے ساتھ سنگانوے کی امانت انہی کو لوٹانے کی پوری کوشش کررہی ہے۔ انشاء اللہ اس مقدس نقش کا سراغ مل جائے گا۔

مشکل یہ تھی کہ ہمارے ملک کے تفتیشی ادارے اپنی ناقص کارکردگی کے باعث بالکل قابلِ اعتماد نہیں رہے۔ ہر ادارے میں نااہل اور سفارشی لوگ ہر دور میں بھرتی کیے گئے جنہوں نے کرپشن کے سوا کسی شعبے میں نام پیدا نہیں کیا۔ ان سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ اس مقدس نقش کی چوری کرنے والوں کو پکڑیں گے۔ تفتیش کے لیے وہ ایک ہزار افراد کو راتوں رات چھاپا مار کے گرفتار کرسکتے تھے اور سو افراد سے اعترافِ جرم بھی کراسکتے تھے مگر مقدس نقش کی بازیابی کے بغیر یہ سب لاحاصل تھا۔

مسز خیال آگاہی بلاشبہ حیرت انگیز عورت تھی۔ اس کی ذہانت اور قابلیت، انتظامی صلاحیت اور معاملہ فہمی کے ساتھ خطابت کا مدلل انداز، لب ولہجہ اور اعتماد سب متاثر کرنے والا تھا۔ وہ مسلسل ڈیڑھ گھنٹا بولتی رہی تھی اور اس دوران میں صرف ایک بار پانی پینے کا وقفہ آیا تھا اور دوسری بار چائے کا مگر اس کی گفتگو کا تسلسل برقرار رہا تھا۔

موقع پا کے میں نے کہا "مسز خیال آگاہی۔ جہاں تک مجھے علم ہے خانس آرٹ گیلری سے کچھ چرانا عملی طور پر اتنا ہی ناممکن ہے جتنا آسمان سے چاند چرانا۔ پھر بھی.....ناممکن کو ممکن کر دکھانے والے موجود ہیں' آپ کو کس پر شک ہے؟"

اس نے میری بات سکون سے سنی "ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ہے مسٹر زمان۔ آپ کا کہنا بجا کہ سخت ترین حفاظتی انتظامات میں خانس آرٹ گیلری سے بڑھ کر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ گیلری کے تین ونگ ہیں یعنی تین بازو۔ ہر حصے کی لمبائی کا اندازہ آپ نے باہر سے کر لیا ہو گا۔ ہر ونگ کے دو دروازے ہیں۔ ایک باہر جانے کے لیے اور دوسرا وہ جو مرکزی گول ہال میں کھلتا ہے گویا کل چھ دروازے ہیں۔ ان میں سے تین ہی کھولے جاتے ہیں۔ ہر ونگ کے آخری حصے کا دروازہ باہر کی طرف کھلتا ہے مگر اس کا نظام ایسا ہے کہ باہر سے اس کو کسی طرح بھی نہیں کھولا جا سکتا۔ اسے کھولنے کا سارا نظام اندر ہے اور الیکٹرانک ہے۔ رات کے وقت اندر ایک ہی چوکیدار ہوتا ہے جو گیلری کے تینوں حصوں میں گشت کرتا رہتا ہے۔ رات والے چوکیدار کی ڈیوٹی بارہ بجے سے صبح آٹھ بجے تک ہوتی ہے۔ صبح آٹھ سے چار دوسرا چوکیدار رہتا ہے اور چار سے بارہ تیسرا۔ چوری کی رپورٹ صبح آٹھ بجے ملی۔ رات بارہ بجے ڈیوٹی پر آنے والے چوکیدار نے بتایا کہ ایک اسٹینڈ خالی ہے جس پر وہ مقدس نقش والا باکس رکھا ہوا تھا۔"

میں نے کہا "گویا چوری رات بارہ بجے سے پہلے ہوئی۔"

"یس۔ شک اسی چوکیدار غلام نبی پر کیا گیا جو شام چار سے رات بارہ بجے تک موجود تھا۔ باہر سے کوئی اندر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ خود اس نے اندر سے دروازہ کھولا اور وہ چیز اپنے کسی ساتھی یا چوروں کے کسی ایجنٹ کو تھمادی۔ شک کی مزید وجہ یہ بھی ہے کہ اس واقعے کے بعد غلام نبی روپوش یا غائب ہو گیا۔ ہم نے اس کی رپورٹ ایس پی اسلام آباد کو کر دی ہے۔ وہ ایک ذہین اور معاملہ فہم شخص ہے۔ اس نے چوکیدار غلام نبی کی بیوی کو اٹھوا لیا۔ ان کے بچے نہیں ہیں۔ ایک رات کی تفتیش سے یہ معلوم ہوا کہ غلام نبی اور اس کی بیوی دونوں ہیروئن کے عادی ہیں۔ غلام نبی اوسطاً ڈیڑھ سو روپیہ روز ہیروئن پر خرچ کرتا تھا اور تقریباً اتنا ہی نشہ اس کی بیوی کرتی تھی۔ چوکیدار کو گیلری سے تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی۔ تین سو روپے روز کے حساب سے وہ نو ہزار روپے اس نشے کی لت پالنے پر کیسے خرچ کرتا تھا؟ اس کی آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ نہ یہاں رشوت خوری کے امکانات ہیں اور نہ خورد بُرد کے۔ اس کی بیوی یہ نہیں بتا سکی کہ چوکیدار ہیروئن کہاں سے اور کیسے لاتا تھا۔ نشے کی یہ لت بھی صرف چار ماہ پہلے پڑی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس مقدس نقش والے باکس کو وہاں سے نکالنے والوں نے چوکیدار کو استعمال کیا۔ پہلے اسے ہیروئن کا عادی بنایا۔ پھر اس کی بیوی کو۔ وہ دونوں کو باقاعدگی سے ہیروئن سپلائی کرتے رہے یہاں تک کہ میاں بیوی دونوں کے لیے ہیروئن ایک ناگزیر مجبوری بن گئی جس کے بغیر ان کا زندہ رہنا مشکل تھا۔"

میں نے خیال آگاہی کی بات کاٹ دی "معاف کیجئے خاتون۔ کیا آپ میں سے کسی نے چوکیدار غلام نبی کے رویے میں تبدیلی کو نوٹ نہیں کیا تھا؟"

میرے سوال کا جواب چوہدری اللہ دتا نے دیا "زمان صاحب۔ پہلی بات تو یہ کہ ہیروئن لینے والے اور شراب پینے والے میں فرق ہے۔ شراب پی کے آدمی حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کا اپنے قول و فعل پر اختیار باقی نہیں رہتا۔ وہ شور ہنگامہ یا بے سروپا بکواس اور حرکات کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہیروئن پینے والا پُرسکون رہتا ہے اور ابتدا میں اس کا استعمال ہی سکون حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ پھر یہ ضرورتً ایک عادت بن جاتی ہے۔ اگر ہیروئن ملتی ہے تو کچھ نہیں ہوتا۔ استعمال کرنے والا زیادہ پُرسکون اور پُراعتماد محسوس ہوتا ہے۔ ایک ڈاکٹر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہیروئن استعمال کرنے کے باوجود وہ اوپن ہارٹ سرجری کا ماہر تھا اور کسی کو اندازہ تک نہیں تھا کہ اس کا پُرسکون انداز ہیروئن کی وجہ سے ایسا نظر آتا ہے۔ جب ہیروئن نہ ملے تو پھر سب کچھ تہس نہس ہو جاتا ہے اور سکون کے اس سہارے کی خاطر آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ بہن کے زیور بھی بیچ سکتا ہے اور بیوی کی عزت بھی۔ دوسری بات یہ کہ چوکیدار شام چار بجے آتا تھا جب گیلری اور یہ آفس بند ہونے کا وقت ہو جاتا تھا۔ دن کے چوکیدار کا رویّہ سب کے سامنے تھا۔ اس میں فرق آتا تو شاید سب نوٹ کرتے مگر چار سے رات بارہ بجے تک غلام نبی کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک ذمّے دار آدمی تھا اور اس کا ریکارڈ بھی اچھا تھا۔"

وہ خاموش ہوا تو خیال آگاہی نے پھر اپنی بات شروع کی۔

"غلام نبی کو استعمال کرنے والوں نے اچانک ہیروئن کی فراہمی روک دی ہو گی۔ وہ نقد رقم خرچ کر کے دس دن میں پوری تنخواہ اڑا دیتا تب بھی اس کا مسئلہ حل نہ ہوتا۔ اسے تو شاید یہ بھی پتا نہیں ہو گا کہ ہیروئن اب کہاں سے ملے گی۔ جب وہ انتہائی مجبور ہو گیا تو اسے کہا گیا کہ اب وہ خانس آرٹ گیلری سے ایک چیز انہیں فراہم کر دے تو اسے یک مشت کوئی خطیر رقم بھی دی جا سکتی ہے جس سے وہ تمام عمر اپنا شوق پورا کر سکتا ہے اور اس کو باقاعدگی سے ہیروئن فراہم کرنے کی ضمانت بھی دی جا سکتی ہے۔ غلام نبی نے ان کی بات مان لی۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا 'یہی کرتا۔"

"یہ آپ کا مفروضہ ہے یا حقیقت؟" میں نے کہا۔

"ہر حقیقت پہلے ایک مفروضہ ہوتی ہے مسٹر زمان!" خیال آگاہی نے اپنے غیر جذباتی انداز میں کہا "ایس پی نے غلام نبی کے ملنے جلنے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں مگر وہ سب عام

شریف لوگ تھے۔ ان میں کوئی بھی ہیروئن کے دھندے میں ملوث ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ چوکیدار کی بیوی بھی اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکی کہ ہیروئن غلام نبی لایا تھا۔ بچے نہ ہونے کے باعث ان کی ازدواجی زندگی سخت فرسٹریشن کا شکار تھی اور وہ ہر وقت لڑتے رہتے تھے۔ چوکیدار بیوی پر شک کرتا تھا کہ رات کو جب وہ ڈیوٹی پر چلا جاتا ہے تو بیوی کسی آشنا کے ساتھ عیش کرتی ہے۔ بیوی کو شک تھا کہ وہ رات کے وقت گیلری میں اکیلا نہیں ہوتا اور اس ڈیوٹی کی آڑ میں وہ عیش کرتا ہے۔ اس نے ہیروئن استعمال کی اور پھر سکون کا یہ نسخہ بیوی پر آزمایا۔ اس کے نتیجے میں ان کی ازدواجی زندگی پُرسکون ہوگئی۔ غلام نبی کی بیوی ابھی پولیس کی تحویل میں ہی تھی کہ چوکیدار کی لاش مل گئی۔"

میں چونکا "لاش.... یعنی اسے قتل کردیا گیا؟"

خیال آگاہی نے اقرار میں سرہلایا "ظاہر ہے اسے استعمال کرنے والے اپنے مقصد میں کامیابی کے بعد افشائے راز کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی رقم بھی بچالی ہوگی جس کے لالچ میں غلام نبی نے چوری کی تھی۔ قاتلوں نے اپنا کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ پیشہ ور لوگ تھے۔ یہ سارا پلان انہوں نے اگست کے بعد بنایا ہوگا۔ اگست میں نمائش ملتوی نہ ہوتی تو سنگانوے کی چیزان کے سفیر کو واپس کردی جاتی۔ اگست سے دسمبر کے دوران میں سنگانوے میں سیاسی تبدیلی آئی۔ سنگانوے کا ایک تہائی حصہ باغیوں کے قبضے میں چلا گیا اور انہوں نے اس کا نام کمپوریا رکھ دیا۔ اس مقصد کے لیے مقدس نقش کا حصول ان کی سیاسی ضرورت تھا۔ انہوں نے پانچ ماہ میں یہ کام کرلیا۔"

میں نے کہا "پھر اب کیا ہوسکتا ہے....؟"

تاج بخت خان نے چوہدری اللہ دتا کو اشارہ کیا اور اس نے سرہلا کے کہا "پہلے تو ہمارا خیال بھی یہی تھا کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا لیکن چوکیدار کی لاش ملنے کے بعد تیسرے دن شام کے وقت کسی نے ہماری مسز خیال آگاہی سے فون پر بات کی۔"

میں نے کہا "پھر باقی بات بھی خیال آگاہی کو بتانے دیں۔"

خیال آگاہی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اجازت پاکے کہا۔ "فون کرنے والے نے کہا کہ وہ مقدس نقش والا باکس اس کے پاس ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا' وہ سب بکواس ہے۔ اصل نقش ابھی تک سنگانوے میں ہے اور کہیں مدفون ہے۔ حکومت کے ایک دو اہم لوگ ہی اس جگہ کے بارے میں جانتے ہیں۔ اس کی حفاظت پر حکومت کی بقا کا انحصار ہے۔ یہ باکس ایک ہزار سال پرانا کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کا سارا کام مشینی ہے۔ ہاتھی دانت کی جالی اور پیتل کے نقش دستکاری کا نمونہ نہیں ہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "دخل اندازی کی معافی چاہتا ہوں مگر مسز خیال آگاہی' کیا یہ آپ کی نظر نہیں دیکھ سکی تھی۔ آپ مصور ہیں۔ آرٹ گیلری کی ڈائریکٹر ہیں۔"

اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا "میں نے یہ بات چیئرمین صاحب کو بتادی تھی مگر ہم سنگانوے کے سفیر کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے تھے۔ انہوں نے جو کہانی سنائی' ہم نے سن لی اور جو چیز پیش کی وہ نمائش کے لیے رکھ دی' ہم کسی ملک سے آنے والی چیز کو مسترد کیسے کرسکتے تھے۔ یہ سفارتی آداب کے خلاف ہوتا۔"

"آپ ذرا تحمل سے کام لیں" وزارتِ ثقافت کے نمائندے نے بُرا مان کے کہا "سب معلوم ہوجائے گا۔"

مسز خیال آگاہی نے مجھے معذرت آمیز نظروں سے دیکھا۔ "فون کرنے والے نے کہا کہ آپ دو دن میں تصدیق کرلیں۔ سنگانوے کے سفیر سے پوچھ لیں کہ یہ بات صحیح ہے یا غلط۔ اس باکس کی اہمیت کا اصل سبب کچھ اور ہے۔ اگر اسے صرف باکس چاہیے تو میں اس کے گھر دے آتا ہوں مگر وہ مطمئن نہیں ہوگا۔ میں نے پوچھا کہ تم کون ہو اور اس باکس سے تمہارا کیا تعلق ہے تو وہ بولا کہ یہ سب رفتہ رفتہ سامنے آجائے گا۔ ہم نے سفیر سے رابطہ کیا اور انہیں یہاں آنے کی زحمت دی۔ یہ بات سُن کے اس کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے بالآخر تسلیم کیا کہ فون کرنے والے کی بات غلط نہیں تھی۔ اصل اہمیت ایک نقشے کی ہے جو اس باکس میں بڑی ہوشیاری سے چھپایا گیا تھا اور باکس کو نمائش میں رکھوانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ محفوظ رہے۔"

میں نے کہا "کسی خفیہ خزانے کا نقشہ؟"

"جی نہیں" خیال آگاہی نے جُزبُز ہوکے کہا۔

میں نے بے صبری سے کہا "تو یورینیم کے ذخائر کی رپورٹ ہوگی۔"

تاج بخت خان کے ماتھے پر ناگواری کی ہر شکن کا مطلب وہی تھا جو اس سے پہلے وزارتِ ثقافت کے سیکریٹری صاحب کے ریمارکس کا "مسز خیال آگاہی' ہماری ترجمان ہیں۔ ان کے بیان کے بعد آپ سوال کرسکتے ہیں۔"

"دو دن بعد اس شخص نے پھر فون کیا۔ ہم نے پورا بندوبست کرلیا تھا۔ فون آبزرویشن پر تھا اور پیغام ریکارڈ ہورہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس وقت صرف میں اس جگہ کی نشاندہی کرسکتا ہوں جہاں پانچ امریکن اسٹنگر میزائل موجود ہیں۔ میں ایک پاکستانی بہرحال ہوں اس لیے صرف پچاس لاکھ میں اپنی حکومت سے سودا کرسکتا ہوں۔ امریکی حکومت یہ میزائل ایک ملین ڈالر فی میزائل کے حساب سے خرید رہی ہے۔ ہماری حکومت کو پانچ ملین ڈالر مل جائیں گے۔ میں صرف پانچ ملین روپے مانگ رہا ہوں۔ ڈالر نہیں' لیکن میرے پاس دوسرے خریدار بھی ہیں جو مجھے ڈالر میں ادائیگی کرسکتے ہیں۔ یہاں طالبان کے افغان نمائندے بھی بیٹھے ہیں۔ خود امریکن سی آئی اے ہے۔ اسلامی ممالک کے جذبۂ ایمانی سے سرشار مجاہدین جن کو امریکا بنیاد پرست کہہ کے بدنام کرتا ہے اور

دہشت گرد تنظیمیں بھی ہیں۔ حکومتِ پاکستان کے لیے پچاس لاکھ کچھ نہیں۔ اس کی بین الاقوامی ساکھ بھی بچ جائے گی۔ اسے کچھ زرِمبادلہ بھی مل جائے گا اور میزائل غلط ہاتھوں میں نہیں جائیں گے۔ اگر سودا منظور ہو تو روزنامہ "خبرساز" کراچی کے کرائم رپورٹر اور کالم نگار بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی عرف بزدل کی خدمات حاصل کی جائیں۔ سودا صرف انہی کی معرفت ہوگا اور کسی طرح نہیں۔ ہم نے یہ پیغام ریکارڈ کرلیا۔ فون کسی پبلک کال آفس سے کیا گیا تھا مگر پولیس نے بڑی مستعدی دکھائی اور پیغام ختم ہونے سے پہلے وہاں جا پہنچی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ ریسیور کے سامنے مناسب آواز کے ساتھ ایک ٹیپ ریکارڈر چل رہا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر نیچے رکھا ہوا تھا اور فون کا ریسیور لنک کراس کے سامنے آگیا تھا۔ پولیس نے وہ ٹیپ ریکارڈر بھی قبضے میں کرلیا اور اصل ٹیپ بھی۔ اب آپ ٹیپ کیا ہوا پیغام سُن لیں۔"

خیال آگاہی نے پہلے سے میز پر موجود ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبایا اور میں نے اس ہوشیار آدمی کی آواز سنی۔ وہ بہت پُرسکون لہجے میں بڑے اعتماد کے ساتھ بات کررہا تھا۔ اس نے یہ وضاحت بھی کردی تھی کہ سودا کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہ لیا جائے کہ رقم میں ایک روپیہ بھی کم ہوگا۔ نولاکھ ننانوے ہزار نوسو ننانوے روپے پچانوے پیسے۔ باٹا کے ریٹ ہیں اپنے۔۔۔ لیس آرنو۔"

خیال آگاہی رخصت ہوگئی۔ اس نے ترجمان کے فرائض ادا کردیے تھے اور اب معاملہ بورڈ آف گورنرز کے اختیارات کا تھا کہ وہ مجھ سے معاہدہ کرتے ہیں یا نہیں۔

ہائی کورٹ کے جج اوصاف علی نے سب سے پہلے کہا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں مسٹر زماں کہ انہوں نے صرف آپ کا نام ہی کیوں تجویز کیا؟"

میں نے سوچ کے کہا "پوچھ تو آپ کچھ بھی سکتے ہیں مثلاً یہ کہ سنگانوے کہاں ہے اور اس کے دارالخلافے کا کیا نام ہے مگر جواب وہی ہوگا کہ مجھے نہیں معلوم۔"

"معلوم کیسے نہیں۔ آپ کے جرائم پیشہ افراد سے پرانے اور بڑے دوستانہ مراسم ہیں" وزارتِ ثقافت کا سیکریٹری غیاث بخش بولا۔

"یہ خوش قسمتی ہے آپ کی۔۔۔۔" میں نے کہا "ورنہ آپ کس کے ذریعے بات کرتے؟ اگر کوئی اور ہے آپ کی نظر میں تو مجھے اجازت۔"

تاج بخت نے مجھے اشارے سے بیٹھنے کو کہا "ہم نے ایسے ہی آپ کے سفر اور ہوٹل کے اخراجات برداشت نہیں کیے ہیں۔"

اللہ دتا نے کہا "بیس فیصد کمیشن آپ کا، یعنی دس لاکھ۔"

"حکومت کو پچاس نہیں ساٹھ لاکھ ادا کرنے پڑیں گے" غیاث بخش نے بڑے دکھی دل سے کہا۔ یہ قوم کے خزانے سے جانے والی رقم کا دکھ نہیں تھا۔ غالباً اس بات کا دکھ تھا کہ خود اس کو کچھ بھی نہیں مل رہا تھا۔

میں نے کہا "یہ میرا حقِ محنت ہے۔"

"حقِ محنت!" غیاث بخش بھڑک اٹھا "تم جاؤ گے اور رقم اس کے حوالے کرکے آدھے گھنٹے میں لوٹ آؤ گے۔"

میں نے تلخی سے کہا "ایسا کریں۔ آپ چلے جائیں۔ یہ مت بھولیں کہ مجرم کسی پر بھروسا نہیں کرتے۔ یہ تو کوئی دہشت گرد ہیں۔ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ وہ رقم لے کر مجھ پر صرف ایک گولی خرچ کریں اور کچھ بھی دیے بغیر چلے جائیں۔ آپ کے ساٹھ لاکھ کیا' میری زندگی سے زیادہ اہم ہیں۔ ایسا کئی بار ہوچکا ہے کہ تاوان کی رقم وصول کرکے مجرموں نے اغوا ہونے والے کو بھی جان سے ماردیا کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ بعد میں وہ ان کے نام اور حلیے بتادے گا۔ بعض اوقات گھر کے بھیدی ہی لنکا ڈھاتے ہیں۔"

"اوکے۔۔۔اوکے۔۔۔۔ دس لاکھ آپ کے۔" تاج بخت بولا۔

اوصاف علی نے کہا "کیا اس کے بعد کوئی ضمانت ہوگی۔"

"کوئی ضمانت نہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی مجھ سے رقم چھین کے بھاگ جائے۔ میرے ہاتھ میں شطرنج کی بساط تھما جائے لیکن اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ انہیں مجھ پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا مجھے ان پر۔۔۔"

اللہ دتا نے کہا "چلو جی گل مک گئی لیکن یہ بتاؤ کہ ان مجرموں کی گرفتاری کے لیے آپ پولیس کے ساتھ کیا تعاون کروگے؟"

"سوری۔ مجرم کو پکڑنا پولیس کا کام ہے۔ میں اس میں کسی قسم کا تعاون نہیں کروں گا۔ اگر مجرم میری جان پہچان کا ہو۔ مجھے اس کا نام معلوم ہو تب بھی میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ یہ میری گڈول کا ہی نہیں میری زندگی کا سوال بھی ہے۔ جس دن میں نے ان کے اعتماد کو دھوکا دیا' وہ مجھے اس چلتی چکی میں ڈال کے پیس دیں گے جسے دیکھ کے کبیرا رویا تھا۔"

اوصاف علی مسکرایا۔ اللہ دتا نے قہقہہ مارا۔ غیاث بخش کا منہ اور لمبا ہوگیا۔

تاج بخت نے کہا "تم اب کیا کروگے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ میں پانچ لاکھ ایڈوانس وصول کرکے واپس کراچی چلا جاؤں گا۔ جب وہ شخص پھر فون کرے تو آپ اسے بتادیں کہ سودے کی بات مجھ سے کرے۔ میرا کراچی کا فون نمبر اسے معلوم ہوگا۔ اگر اس نے مجھ سے رابطہ کیا تو آپ کو رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ فوری طور پر مثلاً چوبیس گھنٹے میں۔"

"ہوجائے گا" چیئرمین تاج بخت خان نے مختصراً کہا۔

"یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں سوسو کے پرانے نوٹ مانگوں۔ مانگنے والوں کے مانگنے پر۔"

"یہ بھی ہوجائے گا۔ کوئی پہلی فلائٹ سے آجائے گا وہیں

کراچی میں کسی بینک کے ذریعے کوئی بندوبست کردیا جائے گا۔ اور کچھ؟"

"اور کچھ نہیں" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایسے نہیں بادشاہو۔" چوہدری اللہ دتا بولا "آج دوپہر کا کھانا تو کھالو ہمارے ساتھ۔ ہم تو ویسے بھی بڑے شوق سے پڑھتے ہیں آپ کا کالم۔ کیا نام ہے' سچی باتیں جھوٹے آدمی کے قلم سے۔"

غیاث بخش نے افسوس سے سرہلایا "آپ واقعی بزدل ہیں۔ یعنی آپ چوروں کی مدد کررہے ہیں ایک صحافی ہوکے۔"

میں نے کہا "مدد کے لیے مجھے آپ نے بلایا تھا۔ یہ مت بھولیے۔"

"مگر نمائندے آپ چوروں کے ہیں" وہ خفا ہوکے بولا۔

"نمائندہ میں آپ کا بن کے جارہا ہوں" میں نے مسکرا کے کہا۔ وہ مزید خفا ہوا مگر میں نے غلط نہیں کہا تھا۔

○☆○

صائمہ اس تمام صورتِ حال سے خوش نہیں تھی۔ وہ میری دعوت پر ہالیڈے اِن میں ڈنر کھا کے بھی خوش نہیں ہوئی تھی۔ اس کا ڈپریشن برقرار تھا کہ دس لاکھ کے اس سودے میں میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

"یا تم اپنی جان سے جاؤ گے' بڑے چور دس لاکھ نہ لے گئے تو چھوٹے چور سب لے جائیں گے۔ تمہارے جواری دوست۔"

بالآخر میں نے آخری حربے کے طور پر پانچ لاکھ کا چیک اس کی خدمت میں پیش کردیا۔ "یہ لو' اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادو۔ اب تو یقین کرلینا چاہیے تمہیں کہ میں نے جوا نہ کھیلنے کی قسم کھالی ہے۔ میں ایک اچھے مستقبل کے خواب کو تعبیر دینا چاہتا ہوں۔"

اس نے بے یقینی سے چیک کو دیکھا پھر اس کا چہرہ کِھل اٹھا۔ اس نے چیک کو احتیاط سے اپنے بیگ میں رکھ لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ فون مجھے توپ صاحب نے عارضی استعمال کے لیے بخش دیا تھا۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ ایک اہم کال کے لیے میرا ہر وقت ہر جگہ دستیاب رہنا ضروری ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ فون ہر وقت ہر جگہ میرے ساتھ ہو۔ میں اپنے فون کے ساتھ گھر میں قید نہیں رہ سکتا۔

میرے ہیلو کہنے پر کسی عورت نے کہا "بزدل صاحب' آپ کے لیے ایک پیغام ہے۔ غور سے سُن لیں' کوئی بات دہرائی نہیں جائے گی۔"

میں اُٹھ کے کچھ فاصلے پر دیوار کے قریب چلا گیا "فرمایئے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

حسبِ توقع وہ پیغام انہی کی طرف سے تھا جو پچاس لاکھ میں پانچ اسٹنگر میزائل فروخت کرنا چاہتے تھے اور ایک محبِ وطن پاکستانی ہونے کی وجہ سے حکومتِ پاکستان کو دوسروں پر ترجیح دینے کی بات کرتے تھے اور احسان بھی جتاتے تھے کہ وہ گھاٹے کا سودا کررہے ہیں۔ میں نے خاموشی سے پورا پیغام سنا۔ میرا خیال اس وقت بھی یہ تھا کہ میں پبلک بوتھ میں رکھے ہوئے کسی ٹیپ ریکارڈر سے مخاطب ہوں۔ تصدیق کچھ دیر بعد ہوگئی جب پیغام ختم ہوتے ہی میرے کانوں میں گانے کی آواز آئی "کبوتر جا جا جا.... کبوتر جا..."

میں لوٹ کے اپنی میز پر آیا تو ظالم خان کو شریفانہ کپڑوں میں دیکھنے کے باوجود مجھے اس کی دخل اندازی پر غصہ آیا "تم اس وقت یہاں کیا کررہے ہو؟"

"اچھا سوال ہے" اس نے سرہلایا "میں ڈاکٹر صائمہ سے تمہارے ہولناک مستقبل کی بات کررہا تھا اور انہیں سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔"

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم اسے ورغلانے میں مصروف تھے" میں نے کہا۔

صائمہ نے مجھے گھور کے دیکھا اور اپنا بیگ اٹھالیا "دس بجے میری شفٹ میں ڈیوٹی ہے" اس نے گھڑی دیکھ کے کہا "آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گی میں۔"

ظالم خان اسے شیشے کے دروازے سے گزر کے جاتا ہوا دیکھتا رہا "لڑکی اچھی ہے مگر افسوس کہ قسمت خراب ہے اس کی۔ خیر' میں تمہیں ایک اچھی اور ایک بُری خبر سنانا چاہتا تھا۔"

"پہلے اچھی خبر سناؤ" میں نے کہا۔

"اچھی خبر یہ ہے کہ ایس پی صاحب نے مجھے اس خصوصی ٹیم کا سربراہ مقرر کیا ہے۔ ایس پی اسلام آباد کے کہنے پر' جو اس معاملے کی تفتیش کرے گی۔"

"کس معاملے کی؟" میں نے انجان بن کے کہا۔

"جس کے لیے تم اسلام آباد گئے تھے۔ میں نے پانچ لاکھ کا وہ چیک بھی دیکھ لیا ہے جو تم نے صائمہ کو بے وقوف بنانے کے لیے اس کے حوالے کردیا ہے۔ چونکہ میں دوست ہوں تمہارا اس لیے میرا تم سے ملنا شکوک پیدا نہیں کرسکتا۔ میں تمہاری مدد بھی کرسکتا ہوں اور نگرانی بھی۔"

میں نے سکون سے کہا "آپ اور آپ کے ایس پی صاحب مع ایس پی اسلام آباد.... سب جائیں بھاڑ میں..... اگر کسی نے اس معاملے میں دخل اندازی کی تو میں پیچھے ہٹ جاؤں گا۔ میں پانچ لاکھ کا چیک بھی صبح واپس بھیج دوں گا۔"

"اکیلا چنا بھاڑ نہیں جھونک سکتا۔"

"پھر آپ سب مل کے جھونک لیں۔ مجھے کیا ضرورت تھی اتنی تکلیف دینے کی۔ اس چکر میں ہوگا کچھ نہیں بس میری جان جائے گی۔ جو مجھ پر اعتبار کرتے ہیں ابھی' مجھے گولی ماردیں گے۔" میں نے برہمی سے کہا "ابھی ابھی انہوں نے مجھ سے فون پر رابطہ کیا

تھا۔ دوبارہ فون آئے گا تو میں خود کہہ دوں گا کہ میرا اب اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ جو کرنا ہے پولیس کرے گی بلکہ میں ابھی بات کرتا ہوں، تمہارے ایس پی اسلام آباد سے۔"

انسپکٹر رحم دل خان صرف مسکراتا رہا مگر ایس پی اسلام آباد سے بات کرنے کے بعد میں نے فون اسے تھمایا تو اس کا چہرہ اتر گیا۔ کچھ دیر یس سر اور نو سر کرنے کے بعد اس نے فون مجھے واپس کردیا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کہا "جانے سے پہلے بُری خبر بھی سنادو۔"

"تمہیں بتایا نہیں ایس پی صاحب نے؟ وہ جو چوکیدار تھا غلام نبی.... جس کی بیوی سے پولیس تفتیش کررہی تھی، اس نے خودکشی کرلی ہے.... اپنے گھر میں چھت کے پنکھے سے لٹک کر۔ اس سے کچھ معلوم نہیں ہوا؟"

میں نے تلخی سے کہا "آفرین ہے تم لوگوں کی ڈھٹائی پر۔ زمانہ بدل جائے مگر تمہارا اندازِ تفتیش نہیں بدلے گا اور نہ یہ خودکشی والا بیان..."

"درحقیقت یہ خودکشی نہیں تھی، قتل تھا۔ اسے گلا گھونٹ کے مارا گیا اور پھر اس کی لاش پنکھے سے لٹکادی گئی۔ میرا مقصد صرف تمہیں خبردار کرنا تھا۔ دو قتل ہوچکے ہیں، تیسرا تمہارا نہ ہوجائے..."

"تم لوگوں نے مجھے میرے حال پر نہ چھوڑا تو ضرور ہوجائے گا..."

"چلو میں تمہیں آفس چھوڑدوں؟" وہ اٹھتے ہوئے بولا "مجھے تمہارا وہ دوست ملا تھا.... شرافت علی۔ وہی جو چوری کے الزام میں جیل گیا تھا۔ آج کل چوری کا مال خریدتا اور بیچتا ہے۔ دراصل مجھے بچوں کے بیڈروم کے لیے ایک ٹی وی کی ضرورت تھی..... میں نے سوچا کوئی سستا سا مل جائے۔"

میں اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا "یا مفت مل جائے۔"

"اس نے مجھے تحفے میں دے دیا۔ تقریباً نیا ٹی وی ہے چودہ انچ کا۔" ظالم خان معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا "اس کی اور میری ملاقات خاصی دوستانہ رہی۔ میں نے اس سے کہا کہ ہمارا دوست بزدل ہے لیکن ہم دونوں بہادر نہ ہوتے تو اس پیشے میں کامیاب نہیں ہوسکتے تھے۔ جس سے ہمارا تعلق ہے.... اس سے مجھے ایک کام کی بات معلوم ہوئی۔"

میں سیدھا اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ "پھر مجھے کیا۔"

اس نے وضاحت کی "وہ بات تمہارے کام کی ہے۔ یہاں کوئی تمہیں پوچھتا پھر رہا تھا۔ شرافت علی سے بھی ملا تھا۔ یہ چھ سات ہفتے پہلے کی بات ہے۔ وہ بہت سے حوالوں کے بعد شرافت علی کے پاس یہ معلوم کرنے گیا تھا کہ تم کاروباری معاملات میں کس حد تک قابلِ اعتبار ہو اور شرافت علی نے تمہارا دوست ہونے کی وجہ سے کہا کہ تم ہر معاملے میں قابلِ اعتبار ہو..."

میں نے کہا "کون تھا وہ؟"

"شرافت علی نے نہیں بتایا تمہیں؟ ویری بیڈ۔ یہ کیسی دوستی ہے۔ خیر اس کا نام ہے رستم۔ تم جانتے ہو کسی رستم کو؟"

میں نے کہا "اوریجنل رستم تو سیکڑوں ہزاروں سال پہلے ایران کا مشہور پہلوان تھا۔ ویسے آج کل جسے دیکھو رستم بنا پھرتا ہے، تمہاری طرح۔ اور چھپے رستم بھی بہت ہیں۔"

اس نے گاڑی کو میرے آفس سے کچھ فاصلے پر روک کے اوپر دیکھا "اس سے آگے جانے میں خطرہ ہے کہ تمہارا وہ اگالدان ایڈیٹر اس نئی گاڑی کے سفید رنگ کا بیڑا غرق کردے گا۔ اسے بتادینا کہ میں آس پاس کی عمارتوں پر خفیہ ویڈیو کیمرے نصب کرانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بس ایک ثبوت میرے ہاتھ آجائے پھر میں اسے خود پھانسی دے سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "ویڈیو کیمرے غائب ہوکے شرافت علی کے پاس پہنچ گئے تو نقصان کس کا ہوگا۔"

اس نے کہا "تمہیں پانچ لاکھ ایڈوانس مل گئے ہیں تو میرے پچیس ہزار واپس کرنا مت بھولنا۔"

اس نے گاڑی آگے بڑھائی تو میں روزنامہ "خبرساز" کے تھرڈ فلور پر واقع آفس کے زینے کی طرف بڑھا۔ اچانک زینے کے اندھیرے سے ایک سیاہ فام آدمی نکل آیا۔ وہ کپڑوں کے بغیر شاید تاریکی میں دکھائی بھی نہ دیتا۔ اس کے سفید دانت مسکرانے سے یوں نظر آتے تھے جیسے بلیک بورڈ پر چاک کی لکیر۔

"مسٹر زماں۔ میں آپ ہی کا انتظار کررہا تھا" اس نے بڑے دوستانہ لہجے میں عاجزی سے کہا "کیا آپ مجھے چند منٹ دے سکتے ہیں۔ صرف چند منٹ۔ میرا نام میکاسا شلوزی ڈانوگوواندرے ہے مگر وقت بچانے کے لیے میکاسا کافی ہے۔"

میں نے ہاتھ ملا کے کہا "مسٹر میکاسا۔ آپ اسی مسئلے پر بات کرنا چاہتے ہیں؟"

اس نے مطلب سمجھ لیا "بالکل صحیح اندازہ ہے آپ کا۔ یہ میری گاڑی ہے لیکن آپ چاہیں تو ہم سڑک کے بیچ میں بیٹھ کے بھی بات کرسکتے ہیں۔ ٹریفک کا کوئی مسئلہ نہیں۔ دائیں بائیں سے گزر جائے گی۔"

"موت کا ایک دن معین ہے پھر بھی احتیاط کرتے ہوئے ہم سڑک کے کنارے اس ریسٹورنٹ میں بیٹھ جاتے ہیں" میں نے کہا "پیرس میں کتنے اچھے ریسٹورنٹ ہیں فٹ پاتھ پر۔ چائے یہاں زیادہ اچھی ملتی ہے۔ کوئٹہ برانڈ اسپیشل دودھ پتی۔"

میکاسا چھ فٹ قد اور مائیک ٹائی سن جیسا نظر آنے کے باوجود بڑی معصومیت اور مظلومیت آمیز انکساری سے بات کرنے میں ماہر تھا۔ اس کی یہ عاجزی اور مسکینی صاف مصنوعی نظر آتی تھی مگر میں یہ بات اس کے منہ پر نہیں کہہ سکتا تھا۔ مجھے اپنا منہ عزیز تھا۔

وہ فرنچ لہجے میں انگریزی بولتا تھا یعنی ڈی اور ٹی کے بجائے دی

اور تی استعمال کرتا تھا مگر اس کی گفتگو میں روانی تھی اور ایک سیاست داں کا محتاط انداز۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوچ سمجھ کے بولتا تھا اور الفاظ کا انتخاب بھی ہوشیاری سے کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک اچھا ایکٹر تھا اور اپنے لب ولہجے یا انداز واطوار سے اپنی شخصیت کو ضرورت کے مطابق ڈھال سکتا تھا۔

"آپ ذہین آدمی ہیں سر۔ غیر معمولی طور پر ذہین کہوں تو نہ یہ مبالغہ ہوگا اور نہ خوشامد۔ آپ نے اتنی دیر میں اندازہ کرلیا ہوگا کہ میں آپ سے کس مسئلے پر بات کروں گا۔"

میں نے کہا "آپ سنگانوے سے آئے ہیں اور یہاں سفارتی عملے میں شامل ہیں۔"

اس نے بڑی ملائمت سے کہا "میرا تعلق کپوریا سے ہے سر!"

"اوہ۔ باغیوں کی وہ حکومت جسے کسی نے بھی تسلیم نہیں کیا ہے؟"

اس نے یہ ظاہر کیا کہ میرے الفاظ سے اس کو دلی صدمہ ہوا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے زخمی لہجے میں کہا "سر۔ قصور آپ کا نہیں۔ آپ کو یہی بتایا گیا ہے کہ ہم باغی ہیں۔ مظلوم کے لیے یہ لفظ ہر ڈکٹیٹر استعمال کرنے کا عادی ہے اور جو برسرِاقتدار ہو اسے سچا ہونے کی سند خود حاصل ہوجاتی ہے لیکن میں مختصراً عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ سنگانوے کی موجودہ حکومت ایک غیر ملکی طاقت کی مدد سے قائم ہوئی۔ ظاہر ہے یہ کٹھ پتلی حکومت اس سپرپاور کے مفادات کی نگرانی کرتی ہے۔ وہ ملک کے سارے وسائل اس سپرپاور کے پاس گروی رکھ چکی ہے اور اس کے بدلے میں حکمرانوں کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے کہ وہ جیسے چاہیں ملکی وسائل کو اور خزانے کو اپنے غیر ملکی اکاؤنٹ کی تجوریاں بھرنے کے لیے استعمال کریں۔ وہاں فوج اور سرکاری حکام عوام کے ساتھ کیا کررہے ہیں، اس کا اندازہ آپ سنسر شدہ خبروں سے اتنی دور بیٹھ کے نہیں کرسکتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس چھوٹے سے ملک کا عالمی خبروں میں ذکر تک نہیں آتا اور ان کے بارے میں بین الاقوامی برادری کچھ بھی نہیں جانتی۔ وہاں حکومت کے نام پر ظلم اور ناانصافی کا راج ہے۔ عوام کی جان ومال اور آبرو محفوظ نہیں۔ لوگ فاقے کررہے ہیں۔ ان کے پاس اسپتالوں میں دوا علاج کے بغیر مرجانے کے بعد کفن دفن کے اخراجات پورے کرنا مشکل ہے۔ بہت سے لوگ مرنے والوں کو اسپتال میں ہی چھوڑ کے بھاگ جاتے ہیں۔ مائیں اپنے بچے اِدھر اُدھر رکھ جاتی ہیں۔ فٹ پاتھ پر یا چرچ کے سامنے یا کسی پارک کی بینچ پر۔ ظاہر ہے جہاں ایک طرف اتنی غربت اور بے چارگی ہو اور دوسری طرف دولت کے ساتھ ہوس تو عصمت فروشی ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ جوان عورت کو ایک رات کا خریدار۔ آپ کی کرنسی کے مطابق پچاس روپے بخش دے تو دوسری عورتیں اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتی ہیں ورنہ دس روپے میں بھی.... میں کیا عرض کروں۔ کلیجا منہ کو آتا ہے۔ دوسری طرف حکمراں ہیں کہ محلات کھڑے کررہے ہیں۔ قیمتی گاڑیاں خرید رہے ہیں۔ سوئس اکاؤنٹ میں ملین کے حساب سے ڈالر ڈال رہے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے بہت افسوس ہوا یہ سب جان کے۔ میں نے افریقی ممالک میں قحط اور خانہ جنگی کے جو مناظر دیکھے تھے ٹی وی پر.... وہ واقعی رُلانے والے تھے مگر مسٹر میکاسا' میں سمجھا نہیں کہ مجھ سے آپ کیا چاہتے ہیں؟"

اس نے زیادہ دردناک صورت بنالی "سر۔ میں بس چند منٹ اور لوں گا۔ ہم جو آج باغی کہلاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ہی محب وطن ہیں۔ ہم نے عوام کا حق مانگنے کی بات کی تھی اور اس سپرپاور کے ہاتھوں ملک کو رہن رکھنے کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ ہمارا پورا قبیلہ اس ناانصافی اور ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر ہم سرکاری فوج کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ انہوں نے ہزاروں کو سڑکوں پر درخت سے لٹکا کے پھانسی دی۔ ہزاروں کو مشین گنوں سے بھون کے لاشوں کو سڑنے اور جانوروں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دیا۔ ہمارے گھر جلادیے۔ ہماری عورتوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جو دورِ غلامی میں کنیزوں کے ساتھ بدترین آقا نہیں کرتے تھے۔ اور جو ہوا سرِعام ہوا۔ لاکھوں لوگ جان بچا کے بھاگ گئے اور ہمسایہ ممالک میں بھوک اور بیماری کا شکار ہوئے۔ ان کے پاس نہ گھر تھا نہ پہننے کے لیے کپڑا۔ نہ علاج کے لیے دوا تھی۔ وہ جانوروں کی طرح جنگل میں چھپ کر رہے ہیں لیکن ظلم اپنی انتہا کو پہنچ کے مٹ جاتا ہے۔ ظالم کو دوام نہیں' یہ قانونِ قدرت ہے۔ خدا کا انصاف ہے۔ ہم نے پھر خود کو متحد کیا اور ساری دنیا سے مدد مانگی۔ بالآخر ہم اس قابل ہوگئے کہ اپنے وطن اور اپنے گھر لوٹ سکیں۔ ہمارے پاس اتنی طاقت آگئی کہ ہم جابر حکمرانوں کے سامنے ڈٹ جائیں۔ ہمارا جذبہ نیک تھا اور ہم حق پر تھے۔ اس کے علاوہ سر' جو بھوک سے اور بیماری سے مر رہا ہو' وہ انتقامی جذبات سے پاگل ہوجائے تو خود مرنے سے پہلے دس کو مار سکتا ہے۔ ہم مرنے مارنے پر تُل گئے تھے۔ لالچی اور بے ضمیر حکم کے غلام فوجی ہمارا مقابلہ اسلحے سے کرسکتے تھے' جوش اور جذبے سے نہیں۔ ہم نے ملک کے ایک تہائی حصے پر قبضہ کرکے اپنی جمہوریہ کے قیام کا اعلان کردیا۔ جمہوریہ کپوریا۔ اس کا دارالخلافہ ہے بروغو۔ اب بھی یہ حال ہے سر کہ ہمارے پاس تن پہ کپڑا نہیں۔ مرد عورت سب ایک دو بالشت چوڑی پٹی نچلے حصے پر لپیٹ کر ستر پوشی کرتے ہیں۔ تھوڑی بہت غذائی امداد ہمیں اقوام متحدہ فراہم کرتی ہے' اس سے ہم ایک وقت پیٹ بھرتے ہیں۔ ہم نقد امداد قبول نہیں کرتے۔ اسلحہ مانگتے ہیں۔ مشین گن' کلاشنکوف' دستی بم' بارودی سرنگیں۔"

"اور میزائل....!" میں نے کہا "اسٹنگر میزائل۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "یس سر۔ اگر یہ ہتھیار ہمیں مل جائے تو یہ جنگ ایک دن میں ختم ہوجائے گی۔ جو ویسے شاید مہینوں

چلے گی اور ہزاروں جانوں کا نذرانہ لے گی۔ ایوان صدر، وزیر اعظم ہاؤس، مسلح افواج کے سربراہ کا ہیڈ کوارٹر، اسلحے کا ذخیرہ.... اگر یہ ختم ہو جائیں تو جنگ ختم ہو جائے گی۔ غربت، بھوک اور بیماری ختم ہو جائے گی۔ سنگانوے کا نام کیموریا ہو جائے گا تو اقوام عالم اسے تسلیم کرے گی اور ہمیں ہر قسم کی امداد حاصل ہونے لگے گی۔ عوام پر جبر اور ظلم کا دور ختم ہو جائے گا۔ ہم ملک کی لوٹی ہوئی دولت واپس لے آئیں گے۔ عیاش اور ظالم حکمرانوں کا احتساب کریں گے اور انہیں عبرت ناک سزائیں ملیں گی۔"

میں نے کہا "یہ سب ٹھیک ہے مسٹر میکاسا۔ میں آپ کی نیت پر شک نہیں کر سکتا اور آپ کے عزائم کو غلط نہیں کہتا مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو وہ میزائل فراہم نہیں کر سکتا کیونکہ وہ میرے پاس نہیں ہیں۔"

"سر۔ مجھے سب معلوم ہے۔ آپ نے کیا سودا کیا ہے۔ اس وقت آپ کے سوا کوئی بھی نہیں جو وہ مقدس نقش واپس حاصل کر سکے۔ اور سر، مقدس نقش تو ایک ڈھونگ ہے۔ جب وہ آپ کو مل جائے تو آپ اسے میرے حوالے کر دیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "یہ ناممکن ہے مسٹر میکاسا!"

"کیوں ناممکن ہے سر! ساری بات ہے قیمت کی۔ آپ ہماری طرف سے ایک حقیر آفر قبول کریں۔ ہم آپ کو بیس لاکھ دیں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔"

میں نے سختی سے کہا "مسٹر میکاسا۔ وعدہ خلافی میرے نزدیک ایسا جرم ہے جس کی سزا میرے لیے موت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ میں اپنی حکومت کا وفادار ہوں۔ ایک پاکستانی کسی طرح بھی پیسے کی خاطر اپنے ملک کی بدنامی قبول نہیں کر سکتا۔"

اس نے بڑی لجاجت سے کہا "سر۔ میں آپ کو تصویریں دکھاؤں گا۔ اور کچھ فلمیں۔ آپ ان دردناک حالات کی صحیح تصویر دیکھ لیں۔ اس وقت بھی وہاں بھوک سے بچے مر رہے ہیں کیونکہ ماؤں کی سوکھی چھاتیوں میں ان کے لیے دودھ کا ایک قطرہ نہیں۔ لوگ بیماری سے سڑکوں پر دم توڑ رہے ہیں۔ ننگی عورتیں جانوروں کی طرح...."

میں نے کہا "ویری سوری۔ آپ وہ دس لاکھ لے لیں جو مجھے ملیں گے مگر اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کروں گا۔"

اس کی آنکھوں کا اور چہرے کا تاثر اچانک بدل گیا "سوچ لیں سر۔ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم وہ نقش چرانے میں ناکام رہے۔ کوئی پہل کر گیا مگر کوئی بات نہیں، ہم پھر کوشش کریں گے اور اسے حاصل بھی کر لیں گے۔ ان سے..... یا آپ سے....."

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ اٹھا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا سڑک پار کر گیا۔ اس کی تاریک شیشوں والی سیاہ چمکیلی کار تھوڑا سا آگے بڑھی پھر اوپر سے سرخ رنگ کا تقریباً تیس ملی لیٹر کا مکسچر کار کے ونڈ اسکرین اور بونٹ پر گرا۔

صورتِ حال کی سنگینی کے باوجود میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اسی وقت ایک اندھا فقیر لاٹھی کو فٹ پاتھ کے فرش پر بجاتا نمودار ہوا۔ اس نے کسی سے پوچھا "یہ نیو کوئٹہ حسن زئی ہوٹل ہے بابا..... یہاں بزدل کون ہے؟"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ لوگ اندھے فقیر کے سوال پر ہنسنے لگے تھے۔

فقیر نے کہا "ساڑھے چھ فٹ لمبا.... سامنے اخبار کے دفتر میں کام کرنے والا کون ہے..... اندھے فقیر کو بتا دو بابا۔"

میں نے اس کے پاس جا کے کہا "میں بزدل ہوں بابا.... کیا بات ہے؟"

کچھ لوگ میری بات سے مزید محظوظ ہوئے۔ ان میں سے ایک نے مجھے بہادر بننے کا مشورہ بھی دیا اور کہا کہ اس کا نسخۂ کیمیا وہ مجھے اصلی سلاجیت کی صورت میں فراہم کر سکتا ہے۔ میں فقیر کو کچھ دور لے گیا۔ اس نے مجھے ایک لفافہ دیا۔

"اندھے سے دھوکا مت کرنا.... سو کا نوٹ نقلی مت دینا۔"

میں نے لفافہ جیب میں رکھ لیا "سو کا نوٹ؟ کیا انہوں نے بھی دیا تھا؟"

"ہاں بابا۔ اور کہا تھا کہ تم بھی دو گے۔"

"وہ کون لوگ تھے؟" میں نے مجبوراً سو کا نوٹ اس کی مٹھی میں تھما دیا۔

"اندھا کیا جانے بابا۔ کون تھے کہاں سے آئے تھے؟"

شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اس بوڑھے فقیر کو ایک سال سے دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی اندھا تھا۔ پیغام رسانی کرنے والوں نے صحیح آدمی کا اور صحیح وقت کا انتخاب کیا تھا۔ شاید وہ ہر وقت ہر جگہ مجھے دیکھ رہے تھے یا پھر یہ محض اتفاق تھا۔ میں ہوٹل میں نظر نہ آتا تو لفافہ اوپر میرے آفس میں پہنچ جاتا۔ غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ کیا انہوں نے مجھے مسٹر میکاسا کے ساتھ مذاکرات کرتے دیکھا یا سنا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے اور بہت جلد میرے بھی ہونے والے تھے۔ جذبۂ حب الوطنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسٹنگر میزائل حکومتِ پاکستان کے حوالے کرنے کا واضح مطلب تھا کسی ایک کے ہاتھوں جام شہادت نوش فرمانا۔ تمغۂ حماقت بعد از مرگ ڈاکٹر صائمہ وصول کرے گی۔ ایک کنواری بیوہ۔ جو بیوی بنے بغیر براہِ راست بیوہ ہوئی۔ روتے ہیں چھم چھم نین۔

اوپر اپنے آفس میں جا کے میں نے لفافے کو کھولا۔ اس میں میرے لیے ہدایات تھیں کہ مجھے رقم کب، کہاں اور کیسے پہنچانی ہے۔ میں نے مسز خیال آگاہی کے موبائل فون کا نمبر ملا کے مسٹر میکاسا سے ملاقات کی رپورٹ دی اور پھر خط کا مضمون پڑھا "مجھے اٹھارہ تاریخ کی شام تک رقم چاہیے۔"

"آپ کو رقم فراہم کر دی جائے گی..." اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "آپ کو اور کچھ کہنا ہے؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اب کیا فائدہ۔ اگر میں آپ سے اس وقت ملا ہوتا جب آپ مس فخرالنسا بیگم تھیں تو بہت کچھ کہتا۔ اب تو بس ایک ہی التجا ہے۔"

اس نے خاصی بدمزگی سے کہا "فرمایئے۔"

"میرے سوئم میں ضرور تشریف لایئے گا۔ خرچ آمدورفت بذمّہ لواحقین۔ بریانی قورمہ اچھا ہی ہوگا۔۔" میں نے کہا مگر وہ فون بند کر چکی تھی۔

مجھ پر رقت طاری تھی۔ میں نے جو کالم لکھا وہ شکستہ قبروں اور کارپوریشن کی بے حسی کا شکار قبرستانوں کی حالتِ زار پر تھا۔ قطعہ بھی مجھ سے دردناک ہی لکھا گیا۔

آہیں بھرنا تارے گننا خودکشی اور شاعری
عشق میں سو کام تھے شادی سے "ویلے" رہ گئے
رخصتی اس کی ہوئی تو مجھ سے یوں بولا رقیب
گل گئے گلشن گئے کدو کریلے رہ گئے

توپ صاحب نے کہا "تمہاری یہ حالت کب سے ہے؟ ڈاکٹر صائمہ کی نسبت طے ہوگئی ہے کہیں یا دن میں تم نے مسور کی دال کھائی تھی؟"

میں نے کہا "توپ صاحب۔ میرا کہا سنا معاف کریں اور ذرا لکھ لیں، میرے سوئم اور چہلم کا مینیو کیا ہوگا۔"

اس رات میں خالی ہاتھ کینٹ اسٹیشن کے قریب واقع ایک ہوٹل میں پہنچا۔ اندھے فقیر کی معرفت موصول ہونے والے لفافے میں دی جانے والی نئی ہدایات کے مطابق مجھے اگلا پورا دن یہاں گزارنا تھا۔ یہ فور اسٹار سے زیادہ فلم اسٹار ہوٹل تھا اور یہاں وہ فلمی ستارے زیادہ نظر آتے تھے جن کی روشنی ابھی تک گمنامی کے اندھیرے میں تھی چنانچہ وہ رات کو کسی کی خلوتوں میں اُجالا کرتے تھے اور بقول شاعر، جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں۔

مجھے ڈر تھا کہ کسی نے پہچان لیا تو ہوٹل میں کوئی کمرا خالی نہیں ملے گا۔ اس خیال سے میں نے اپنا نام بھی بدیع الزماں ہی لکھوایا اور اپنا پیشہ ہوٹل کے رجسٹر میں پراپرٹی ڈیلر لکھا۔ ڈاکٹر صائمہ رات کی شفٹ میں تھی۔ میں نے اسے ہوٹل کے کمرے سے تین بار فون کیا۔ اس نے مجھے بڑے مفید مشورے دیے۔

"فرض کرلو کہ تم آٹھویں جماعت کے ایک کند ذہن بچے ہو اور حساب میں بے حد کمزور ہو۔ تمہیں زبردستی پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا ہے کیونکہ صبح تمہارا سالانہ امتحان ہے۔ باقی لوگ ٹی وی پر کوئی فلم دیکھ رہے ہیں۔ تم اپنے کمرے میں اکیلے کاپی پنسل لئے الجبرا کا کوئی سوال سمجھنے کی کوشش کررہے ہو۔ تمہیں یہ سوال کئی بار سمجھایا گیا ہے مگر تم ماشاء اللہ کند ذہن اور غبی ہو۔ تمہیں ضرور نیند آنے لگے گی۔"

دوسری بار میں نے اس ترکیب کی ناکامی کی اطلاع دی "ٹی وی ہے نا کمرے میں۔ ڈش ریسیور کے چینل بھی آرہے ہوں گے۔ دس بجے شروع ہونے والی فلم ایک بجے ختم ہوگی۔ راجیش کھنہ یا شتروگھن سنہا کی فلم ہوگی۔ دس منٹ دیکھنے کے بعد تم سو جاؤ گے۔"

تیسری بار میں نے کہا "اتفاق سے ناناپاٹیکر کی فلم آرہی ہے اور وہ بڑی دلچسپ ہے۔ اب میں ایک زنانہ ڈائجسٹ منگواتا ہوں۔ اسے پڑھنے سے نیند ضرور آجائے گی۔"

میری ترکیب کارگر ہوئی۔ صبح میں دیر تک سوتا رہا اور پھر ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال میں گیا۔ ایک خاتون ویٹریس نے بڑی نظرنواز مسکراہٹ کے ساتھ ناشتا سرو کیا اور ایک اخبار پیش کرکے پوچھا "اور کچھ سر؟ رات آپ نے ایک بجے کے بعد کوئی زنانہ ڈائجسٹ طلب کیا تھا، وہ میں پڑھ رہی تھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔"

"آپ مجھے طلب کرلیتے" اس نے بے حجابانہ کہا "کیا میں ڈائجسٹ سے زیادہ دلچسپ نہیں ہوں۔"

"وہ میں اپنی بیوی کے حکم پر پڑھ رہا تھا" میں نے اخبار پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ مایوس ہوکے لوٹ گئی۔

مجھے کسی ٹیلی فون یا پیغام کا انتظار تھا۔ وقت گزارنے کے لیے میں نے اخبار کے اشتہارات تک پڑھ ڈالے پھر وہیں رکھے ہوئے گزشتہ دن کے اخبارات اٹھالیے۔ ان میں ایک اخبار اسلام آباد سے شائع ہوتا تھا اور غالباً کوئی مسافر اپنے ساتھ لایا ہوگا۔ اس کے اندرونی صفحات پر شائع ہونے والی ایک خبر نے مجھے متوجہ کیا۔ میں نے اسے غور سے پڑھا اور پھر پھاڑ کے اپنی جیب میں احتیاط سے رکھ لیا۔

شام تک ہوٹل کے کمرے میں لاؤنج میں یا ڈائننگ ہال میں قید تنہائی کاٹنے کے لیے صرف ٹیلی فون کرتے رہنا ایک صبر آزما کام تھا مگر اللہ نے میری مشکل آسان کی۔ گیارہ بجے صبح کی ڈیوٹی پر آنے والی خاتون ویٹریس نے مجھے کارڈلیس فون پیش کیا "زماں صاحب آپ ہی ہیں نا۔ آپ کے لیے فون کال ہے۔"

میں ہال کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ یہ پیغام بھی ٹیپ پر چل رہا تھا۔ وہ ہوشیار لوگ تھے۔ پبلک ٹیلی فون پر ٹیپ ریکارڈر چھوڑ کے غائب ہوجاتے تھے۔ پولیس چاہے تو ٹیپ ریکارڈر کو گرفتار کرلے۔ میں نے ریسیور کو کان سے لگایا تو ایک عورت ایسے بول رہی تھی جیسے نمبر غلط ملانے یا بند ہوجانے والا فون نمبر ڈائل کرنے پر ٹیلی فون ڈیپارٹمنٹ کا ٹیپ کیا ہوا اعلان شروع ہوجاتا ہے۔ "اطلاعاً عرض ہے کہ آپ کا مطلوبہ نمبر عارضی طور پر بند ہے۔" کچھ لوگ اس سے بحث کرنے لگتے ہیں کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ابھی رات تو میری بات ہوئی ہے۔ جب ٹیپ پر پیغام مسلسل چلتا ہے تو وہ جھینپ کر ادھر اُدھر دیکھتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ کسی نے کچھ سنا نہیں۔

مجھے ملنے والا پیغام بھی اسی طرح دہرایا جارہا تھا۔ شاید انہیں

معلوم تھا کہ مجھے آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ یہ مشکل سے تین منٹ کا پیغام تھا جو تیس منٹ کے کیسٹ میں بھر دیا گیا تھا۔ چند سیکنڈ کے وقفے سے پیغام پھر شروع ہو جاتا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ سنا اور اچھی طرح سمجھ کے ریسیور آف کر دیا۔

ابھی بارہ نہیں بجے تھے چنانچہ میں نے صرف ایک دن کا کرایہ ادا کیا اور زنانہ ڈائجسٹ کو مایوس چھوڑ کے رخصت ہو گیا۔ ایک معمولی سی چیز نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرا مسئلہ ڈاکٹر صائمہ حل کر سکتی تھی مگر مجھے احساس تھا کہ رات کی ڈیوٹی کے بعد وہ نو بجے سونے کے لیے لیٹی ہوگی۔ اسے دو بجے سے پہلے جگانا بداخلاقی ہوتی۔

میں ہوٹل کے گیٹ پر کسی ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک لمبی چمکیلی سیاہ کار میرے سامنے آکے رک گئی۔ پاور ونڈو کا سیاہ شیشہ بڑی آہستگی سے نیچے اترا اور میں نے مسٹر میکاسا کو مسکراتے دیکھا۔ گاڑی کو اسی کا ہم رنگ شوفر چلا رہا تھا۔

"آیئے سر! میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے۔" اس نے مخصوص عاجزانہ خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

میں نے غصّے سے کہا "جہنم میں۔ جہاں تم جا رہے ہو" اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"یہ اچھا ہوٹل ہے سر۔ ایک رات گزارنے کے لیے" اس نے بڑی معصومیت سے کہا "میں نے سنا ہے...."

"آخر تم کیوں میرے پیچھے لگ گئے ہو بھوت کی طرح؟" میں نے برہمی سے کہا۔

اس کی صورت پر مظلومیت کا تاثر گہرا ہو گیا "یہ میری مجبوری ہے سر۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ پچھلے ایک مہینے سے میں کتنا خوار پھر رہا ہوں۔ میں نے اسلام آباد میں وزارتِ خارجہ کے افسران سے مل کے انہیں قائل کرنا چاہا کہ کپوریا کے مسائل کیا ہیں۔ اگر حکومتِ پاکستان اس کو تسلیم کر لے تو ہماری قوم مشکلات کی دلدل سے نکل سکتی ہے کیونکہ پھر دوسرے اسلامی ممالک بھی پاکستان کی تقلید کریں گے۔ اس کے بعد ایشیائی ممالک....."

"مسٹر میکاسا۔ خارجہ پالیسی بنانا وزارتِ خارجہ کا کام نہیں ہے۔"

"یس سر۔ یہی انہوں نے بھی کہا پھر میں اسمبلی کے اور سینیٹ کے ارکان سے ملا۔ انہیں فلمیں اور تصویریں دکھائیں۔ کپوریا کے عوام کی حالتِ زار پر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑے رقیق القلب ہیں آپ کے عوامی نمائندے لیکن ٹالنے میں ماہر ہیں۔ میں کس کس سے نہیں ملا سر۔ وزیرِ خارجہ سے اسمبلی کے اسپیکر اور سینیٹ کے چیئرمین تک سب نے معذرت کر لی۔ آپ بتائیں سر کہ اب میں کیا کروں؟"

میں نے عیاری سے کہا "آپ کوشش جاری رکھیں۔"

اس نے افسوس سے سر ہلایا اور کچھ دیر خاموشی سے باہر دیکھتا رہا "میرا خیال ہے کہ اب تک انہوں نے آپ سے رابطہ کر لیا ہوگا اور سب طے ہو گیا ہوگا۔"

میں نے کہا "فرض کریں ہو گیا ہے.... پھر...؟"

"پھر آپ ہماری حالتِ زار پر رحم کھائیں سر۔ کل سے آج تک کتنے لوگ بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر گئے ہوں گے۔ کچھ اس وقت بھی سسک رہے ہوں گے 'ایڑیاں رگڑ رہے ہوں گے۔ بھوک سے مرنا آسان نہیں ہوتا سر..... موت بڑے لمبے عذاب سے آتی ہے۔ لوگوں کے ننگے ڈھانچے دیکھے ہیں کبھی آپ نے 'جن کا گوشت گل سڑ رہا ہو۔ معصوم بچوں اور عورتوں کے...."

میں نے چیخ کے کہا "شٹ اپ.... پلیز شٹ اپ۔ مجھے ذہنی اذیت مت دو۔ جو تم چاہتے ہو وہ میں نہیں کر سکتا۔ پچاس لاکھ کوئی اور دے رہا ہے اور تم چاہتے ہو میں انہیں دھوکا دوں؟ جھوٹ بولوں ان سے۔ اپنے اعتماد کے ساتھ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دوں؟ غدارِ وطن بن جاؤں۔ صرف اضافی دس لاکھ کے لیے۔ یہ ناممکن ہے مسٹر میکاسا۔ حکومتِ پاکستان وہ میزائل واپس امریکا کو دے گی۔ پچاس لاکھ ڈالر میں۔ یہ میرے ملک کی عزت کا سوال بھی ہے اور ضرورت کا بھی۔ تم کہیں اور قسمت آزمائی کرو۔ افغانستان چلے جاؤ۔ پیسہ خرچ کرنے سے سب مل جاتا ہے۔"

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "پچاس لاکھ ڈالر۔ اگر اتنا پیسہ ہوتا ہمارے پاس سر تو ہم آپ کی خوشامد کیوں کرتے۔ ہم نے تو بیس لاکھ روپے بھی ڈاکا ڈال کے حاصل کیے تھے۔"

میں اپنے فلیٹ سے کچھ دور ہی اتر گیا۔ مسٹر میکاسا کی گاڑی سیدھی گزر گئی۔ خطرے اور پریشانی کا احساس میرے اعصاب پر سوار ہونے لگا تھا لیکن دلدل میں اتر جانے کے بعد اس سے باہر آنا میرے اختیار کی بات نہیں رہی تھی۔

سودا کرنے والوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں سہراب گوٹھ سے سپرہائی وے پر حیدرآباد کی طرف جاؤں۔ اٹھارویں کلومیٹر کے نشان کے بعد مجھے دائیں جانب ایک پتلی سی سڑک جھاڑیوں کے جنگل میں جاتی دکھائی دے گی۔ سپرہائی وے پر بیسویں کلومیٹر سے بائیں طرف گلشن معمار کا بورڈ ہے۔ اٹھارہ جنوری کی رات گیارہ بجے میں اس بورڈ کے نیچے رک کر انتظار کروں۔ آخری 4.L کی بس وہاں سے گزرے گی تو مجھے مزید ہدایات ملیں گی۔ جب بس گلشن معمار کی طرف مڑے گی تو کوئی ایک رقعہ باہر پھینک دے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر میں واپس جاؤں اور اٹھارویں کلومیٹر سے بائیں طرف جانے والی سڑک پر چلتا رہوں۔ یہ سڑک تھانہ موچکا جاتی ہے۔

آج سترہ تاریخ تھی۔ ابھی مجھے مزید ایک دن انتظار کرنا تھا۔ مجھے امید تھی کہ آج ہی مسز خیال آگاہی دس اور پچاس کے پرانے نوٹوں کی صورت میں مجھے پچاس لاکھ پہنچانے کا انتظام بھی کر دیں

گی۔ میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں شرافت علی سے اپنے بارے میں معلومات حاصل کرنے والے رستم سے مل سکوں۔ آخر وہ کون تھا جو میرے قابلِ اعتماد ہونے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے گیا تھا۔ اس کا پتا معلوم کرنے کے لیے شرافت علی سے ملنا ضروری تھا اور شرافت علی کے غیر شریفانہ دھندے کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں تھا۔ پھر بھی صدر میں گلزار ہوٹل کے اڈے پر اس کا ملنا زیادہ قرینِ قیاس تھا۔

یہ گارڈن روڈ تھی جو گلزار ہوٹل چوک سے آگے ایلنفسٹن اسٹریٹ کہلاتی تھی اور اب زیب النساء اسٹریٹ۔ چوک سے پہلے سڑک کے دونوں جانب ہر قسم کی گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں اور انہیں بیچنے والے خود یا دلال فٹ پاتھ پر بیٹھے خریدار کا انتظار کرتے تھے۔ یہاں پارکنگ ممنوع تھی مگر کاروں کے بروکرز اور پولیس والوں کے درمیان جیو اور جینے دو کے سنہرے اصول پر ایک کاروباری سمجھوتا برقرار تھا۔ جو فوراً گاڑی بیچنا چاہتے تھے وہ بھی یہاں گاڑی کے ساتھ ہی کھڑے نظر آتے تھے۔ بیشتر خریدار اس امید میں آتے تھے کہ یہاں کوئی مجبوری کے تحت گاڑی بیچنے والا مل گیا تو اس سے گاڑی اونے پونے داموں پر مل جائے گی۔ یہ ان کی خوش فہمی تھی۔ مجبور بن کے کھڑے ہونے والے شہر کے کسی نہ کسی شوروم کے ملازم ہی ہوتے تھے اور ایک دو گاڑیاں لوگوں کو بے وقوف بنا کے بھی نکال دیتے تھے۔ یہ مشہور تھا کہ اسی جگہ چوری کی گاڑیوں کے چیسس نمبر میں مناسب ردوبدل کے بعد پنجاب یا سرحد بھیجنے والے ماہرین بھی جمع ہوتے ہیں۔

شرافت علی مجھے ایک تنگ سی گلی میں چائے پیتا ہوا ملا۔ یہ گلی جہانگیر پارک پر کچھ عارضی دکانوں کے قیام سے وجود میں آئی تھی اور یہاں پرانی گاڑیوں کے مالک' ڈرائیور' بروکر... چرانے اور خریدنے والے سب ہر وقت ہنگامی میٹنگ میں مصروف نظر آتے تھے۔ یہاں کھڑے ہو کر گاڑیاں بیچنے والوں میں کچھ طارق روڈ اور خالد بن ولید روڈ پر عالی شان شورومز کے مالک ہو گئے تھے اور کروڑوں میں کھیل رہے تھے۔

شرافت علی نے تھوڑا سا آئیں بائیں شائیں کرنے کے بعد مجھے رستم ایسوسی ایٹس کے بارے میں بتا دیا۔

میں نے کہا "تم میرے دوست ہو پھر تم نے کیوں نہیں بتایا تھا مجھے؟"

"کیا بتاتا" وہ بولا "ایک آدمی نے پوچھا کہ تم کاروباری معاملات میں کیسے ہو۔ میں نے کہا کہ میرا اس سے کاروباری معاملہ کوئی نہیں مگر آدمی کھرا ہے۔ جوئے میں رقم ہار جائے تو ادا ضرور کرتا ہے۔ دو بار قسطوں پر خریدا ہوا ٹی وی بیچ کے ادھار چکایا۔ آج کل ریڈیو سنتا ہے۔ بس اس کے بعد رستم چلا گیا۔"

میں نے رستم ایسوسی ایٹس کو بڑی مشکل سے تلاش کیا۔ وہ ایک اسٹیٹ ایجنٹ تھا۔ اس کی دکان لیاقت آباد میں نیرنگ سنیما کے ساتھ اندر جانے والی گلی میں تھی۔ دکان کی حالت بتاتی تھی کہ اس کا کاروبار کسی طرح بھی خوشحالی کا ضامن نہیں ہے۔ وہ پینتالیس پچاس سال کا کمزور اور بیمار نظر آنے والا شخص تھا۔ مکانوں' دکانوں کی خرید و فروخت یا کرائے پر اٹھانے کا کاروبار ایک جگہ بیٹھ کے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے دس جگہ جانا پڑتا ہے اور کوئی جوان آدمی بھی موٹر سائیکل کے بغیر نہ سروے کر سکتا ہے اور نہ دستاویزات کی رجسٹریشن کے لیے دفاتر کے چکر لگا سکتا ہے۔ اس جیسے شخص کا کام ایک فیلڈ اسسٹنٹ کے بغیر نہیں چل سکتا تھا مگر وہ غالباً مالی طور پر کسی کو ملازم رکھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اونگھنا چھوڑ کے مستعد ہو گیا۔ "آیئے سر! مکان چاہیے کرائے پر یا دکان؟" اس نے ایک بوسیدہ رجسٹر اٹھا لیا۔

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "مجھے شرافت علی نے بھیجا ہے۔"

وہ چونکا "کون شرافت علی!"

"تمہاری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہو سکتی۔ میں اسے یہاں لے آؤں یا تمہیں اس کے پاس لے جاؤں پھر شاید تم کو یاد آ جائے گا۔ میں روزنامہ "خبرساز" کا رپورٹر بزدل ہوں۔ بدیع الزماں دلنواز لالہ موسوی۔ تم یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ مجھ پر کس حد تک بھروسا کیا جا سکتا ہے۔"

اس نے فوراً ہتھیار ڈال دیے "وہ..... میں نہیں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ کوئی اور تھا....." وہ ٹوپی ہٹا کے اپنا بے بال سر کھجانے لگا۔

"اور کوئی کا نام بھی ہو گا کچھ؟"

"نام.... پتا نہیں..... مجھے معلوم نہیں۔"

"وہ تمہارے ہی پاس کیوں آیا تھا آخر۔ آس پاس اتنے لوگ اور بھی ہیں.... تم جتنے رستم ہو' نظر آ رہے ہو۔ یہاں ہر سوال کا جواب دینا آسان ہے۔ تھانے میں تم اس سے زیادہ بتا دو گے جتنا جانتے ہو۔"

رستم کا رنگ اڑ گیا "دیکھو۔ ایک غریب آدمی کو دھمکی مت دو۔ میں ویسے ہی دل کا مریض ہوں۔ بائی پاس ہو چکا ہے۔ اس نے اپنا نام شیر شاہ بتایا تھا۔ ویسے تو ایک علاقہ بھی ہے شیر شاہ.... پرانی گاڑیوں کے پارٹس ملتے ہیں وہاں.... اس کا یہی کاروبار ہے۔"

"چوری کی گاڑیوں کو پرزہ پرزہ الگ کر کے بیچنے کا۔ وہ شرافت علی کا پارٹنر ہو سکتا ہے مگر تمہارا ان دونوں کے معاملات سے کیا تعلق ہے؟"

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "تعلق.... کچھ نہیں تھا..... پھر شرافت علی نے کہا کہ..... میں اپنے پرانے اورنگی والے گھر کو کرائے پر اٹھا دوں۔ ایک ڈینٹر پینٹر وہاں کام کرے گا۔ میری آمدنی کم ہوتی جا رہی ہے.... پہلے لڑکا مدد کرتا تھا' باہر کے سب کام سنبھالتا تھا۔ اسے گولی لگ گئی۔ معلوم نہیں پولیس کی یا کسی اور

کی۔ فائرنگ دونوں طرف سے ہو رہی تھی۔ وہ موٹر سائیکل پر گلی سے نکلا اور اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ یہاں تو یہ ہوتا رہتا ہے۔"

میں نے ہمدردی سے کہا "مجھے بہت افسوس ہوا یہ جان کر لیکن تمہارا یہ اورنگی والا مکان۔ کیا وہ شیر شاہ نے کرائے پر لیا تھا؟"

اس نے اقرار میں سرہلایا "علی گڑھ کالونی کے سانحے کے بعد میں نے وہ جگہ چھوڑ دی تھی۔ ایک ہی کمرا بنا ہوا تھا اس میں۔ شیر شاہ نے مجھے اس کا کرایہ تین ہزار روپے ماہانہ دینے کا معاہدہ کیا تو میں انکار نہ کر سکا۔ ضرورت آدمی کو مجبور کر دیتی ہے۔ اب شیر شاہ وہ جگہ خریدنا چاہتا ہے مجھ سے۔ وہاں وہ گاڑیوں کے چیسس نمبر بدلتا ہے۔ ان کا رنگ بدلتا ہے اور رجسٹریشن نمبر بدلواتا ہے پھر گاڑی بک جاتی ہے۔"

"تم جانتے ہو یہ کتنا غیر قانونی اور خطرناک کام ہے۔ اگر تم کبھی لپیٹ میں آ گئے تو ایک رات کی مار برداشت نہ کر سکو گے۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا "میں نے شیر شاہ سے کہہ دیا ہے کہ پانچ لاکھ دے دو' جگہ لے لو۔ وہ مان گیا ہے۔ دیکھو' کب پیسے دیتا ہے۔ پانچ لاکھ مل جائیں تو میں اس جگہ کو ٹھیک کر لوں۔ ایک ملازم رکھ لوں اور چالیس گز کا مکان خرید لوں..... دو ڈھائی لاکھ میں۔"

میں نے کہا "اگر شیر شاہ تمہیں رقم نہ دے یا تمہارے پلاٹ پر زبردستی قبضہ کر لے تو مجھے بتانا۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔"

اس نے مجھے شکر گزار نظروں سے دیکھا اور کارڈ اپنی میز کے دھندلے اور میلے شیشے کے نیچے دبا دیا۔ میں باہر آیا اور سڑک تک پیدل گیا۔ وہاں ایک پی سی او سے میں نے ڈاکٹر صائمہ کو فون کیا۔

ہوسٹل کے میس میں کسی نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "ڈاکٹر صائمہ کے ماموں کا انتقال ہو گیا ہے۔"

وہ ہنسی "پچھلے ہفتے بھی ہوا تھا۔ دوبارہ مر گئے وہ؟"

میں نے کہا "یہ منجھلے ماموں تھے۔ ابھی کافی باقی ہیں۔"

"مسٹر کولمبو۔ وہ نائٹ ڈیوٹی پر تھی مگر میں جگا کے اسے بتا دیتی ہوں کہ تم لنچ پر اس کا انتظار کر رہے ہو" وہ بولی۔

"تم تو سیکرٹ ایجنٹ ہو کوئی" میں نے کہا "کہہ دینا کہ میں عثمانیہ ریسٹورنٹ میں ہوں اور وہ میرے فوت ہونے سے پہلے پہنچ جائے۔ بھوک سے میں اکثر فوت ہو جاتا ہوں اور تھینک یو مس رازداں سہیلی۔"

"شکریہ ادا ہی کرنا ہے تو آنے والا قطعہ سنا دو" وہ بولی۔

میں نے اسے قطعہ سنایا اور فون بند کر دیا۔ باری کا انتظار کرنے والے ایک شخص نے مجھے خون آشام نظروں سے گھورا "یہ فون بوتھ عشق اور شعرو شاعری کرنے کے لیے نہیں لگائے گئے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ صرف اسی لیے لگائے گئے ہیں۔"

ڈاکٹر صائمہ آتش فشاں بنی پہنچی۔ اس کا لال بھبوکا چہرہ میرے لیے غیر متوقع نہیں تھا۔ کرسی پر بیٹھ کے اس نے بیگ کو کرسی پر رکھا۔

"ٹھنڈا پانی" میں نے اسے گلاس پیش کیا "اس سے بلڈ پریشر..."

"ایسی فضول باتیں کیوں کرتے ہو تم میری فرینڈز سے....؟" وہ پھٹ پڑی۔

میں نے کہا "تمہاری فرینڈز کیا سمجھتی ہیں آخر مجھے؟ اس نے انتقالِ پُرملال کی اطلاع پر اناللہ پڑھنے کے بجائے مجھے مسٹر کولمبو کہا.... پھر مجھ سے فرمائش کی کہ شعر سناؤ' کون تھی وہ؟ بے شرم' مجھے ورغلانے والی۔"

صائمہ کا غصہ کچھ کم ہوا "وہ نیلم تھی مگر اس کا حوصلہ تم خود ہی بڑھاتے ہو۔ تم نے اسے متبادل محبوبہ کہا تھا ایک بار...."

"متبادل انتظامات رکھنا عقلمندی ہے۔ تم بھی توپ صاحب کو میری جگہ متبادل محبوب رکھ سکتی ہو" میں نے کہا "خدانخواستہ کوئی مر جائے...."

"میرا کوئی ارادہ نہیں ہے ابھی مرنے کا....." وہ مسکرانے لگی۔

میں نے کہا "جانم۔ میں موت کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ موت کا فرشتہ میرا گھر دیکھ چکا ہے۔ اچانک کسی دن ڈور بیل بجائے گا...."

"ایسی باتیں کرنے کے لیے بلایا ہے مجھے؟ کھانا کھاتے ہی مجھے سونے کے لیے واپس جانا ہے۔" اس نے ہاتھ منہ پر رکھ کے جماہی لی۔

"تمہیں اسلام آباد جانا ہے سویٹ ہارٹ۔ ہم یہاں سے سیدھے ائرپورٹ جائیں گے۔" میں نے کہا "مسٹر اور مسز بزدل کے ہاف ٹکٹ پر واپسی کی سیٹ بھی کنفرم ہو چکی ہے۔"

"واٹ نان سینس میری کل سرجری تھی...."

"کوئی اور کر لے گا۔ تم کو اچانک کچھ ہو گیا ہے۔ نمونیا' ملیریا۔ ہارٹ اٹیک۔ برین ہیمبرج...."

اس نے خفگی سے کہا "آدمی کو سوچ سمجھ کے منہ سے بات نکالنی چاہیے۔"

میں ہنس پڑا "صرف میرے کہنے سے کچھ ہو جاتا تو میں کہتا کہ مسٹر میکا سا کو کینسر ہو جائے مگر وہ آدمی نہیں بھوت کا بچہ ہے۔ کالا جن ہے جو میرے پیچھے لگ گیا ہے۔"

"میکا سا..... یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "کھانا کھاؤ پہلے پھر یہ خبر پڑھو" میں نے جیب سے اخبار کا تراشا نکال کے اس کے سامنے ڈال دیا "ایک کی پوسٹ مارٹم رپورٹ لانی ہے تمہیں اسلام آباد سے۔ تمہارا ایک چاہنے والا وہاں کسی اسپتال میں ایم ایس وغیرہ ہے نا۔ تم اس کا جذباتی استحصال کر سکتی ہو۔ مجھے یہ رپورٹ کوئی نہیں دے گا۔"

"میں اسلام آباد نہیں جاؤں گی" صائمہ نے احتجاج کیا۔
"تمہارا تو باپ بھی جائے گا" میں نے میز پر مکا مارا۔ لوگوں نے سر گھما کے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ویٹر دوڑا ہوا آیا اور کھانے کے برتن اٹھانے لگا۔ ایک بدتمیز جوڑے نے گزرتے ہوئے کہا "ارے یہ تو وہی ہیں 'گلّی ڈنڈا!"

○☆○

ڈاکٹر صائمہ کو روتے بسورتے اسی طرح اسلام آباد بھیجا گیا تھا جیسے بچپن میں مجھے نہار منہ جگا کے ڈانٹ ڈپٹ اور بعض اوقات مناسب گوشمالی کے بعد مدرسے بھیجا جاتا تھا۔ جہاز اڑ گیا تو میرے دل میں بُرے بُرے خیال آنے لگے۔ اگر مسٹر میکا سانے جہاز کو ہائی جیک کرالیا اور پھر مجھ سے مطالبہ کیا کہ اب بولو مسٹر اصول پرست۔ پانچ اسٹنگر میزائلوں کے بدلے تمہیں یہ لڑکی چاہیے یا تم متبادل محبوبہ کی ایڈہاک بنیادوں پر تقرری کروگے؟ جہاز ایک اڑنے والی مشین ہے۔ ویسے بھی کریش ہو سکتا ہے۔ یہ بار تمام عمر میرے ضمیر پر رہے گا کہ صائمہ کو میں نے بلاوجہ اس معاملے میں گھسیٹا اور شہیدِ وفا کے مرتبے پر فائز کیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا سابقہ پرستار اسے زبردستی منگنی کی انگوٹھی پہنا دے کہ اب خود آئی ہو تو خالی ہاتھ واپس کیسے جاسکتی ہو اور واپسی پر صائمہ کہے کہ اب کیا ہو سکتا ہے کولبو' روتے ہیں چھم چھم نین۔"

یہ خیالات ڈپریشن کا نتیجہ تھے۔ مجھے تفریح کی ضرورت تھی مگر مجھے زبردستی ایک ایسے کام میں الجھالیا گیا تھا جس میں گھڑی کی سوئیاں دیکھ دیکھ کے مجھے وقت کے گزرنے کا احساس پریشان کرتا تھا۔ ابھی تک میرا بھی جذباتی استحصال ہوا تھا۔ مجھے دس لاکھ میں خواب کی تعبیر کا ٹریلر دکھا کے مجبور کردیا گیا تھا کہ میں صحافت کی گلی سے نکل کے سیاست کے میدان میں گدھے کی طرح دوڑنے لگوں مگر میرا جسمانی استحصال بھی بعید از امکان نہ تھا۔ اب میں لاکھ کمبل کو چھوڑوں' کمبل مجھے نہیں چھوڑے گا۔

میں نے ایک بار پھر عہد کیا کہ یہ آخری بار ہے۔ اس کے بعد میری توبہ۔ چوروں' ڈاکوؤں اور قانون کے رکھوالوں کے خطرناک کھیل میں مجھے ثالث کا کردار ادا کر کے قبل از وقت عین عالم شباب میں اور صائمہ کے ساتھ اپنے خوابوں کا سنسار آباد کئے بغیر دنیا سے رخصت ہونے کی کیا ضرورت ہے پھر مجھے خیال آیا کہ میرے توبہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ اگلی بار کوئی بالکل نئے ماڈل کی لشکارے مارتی کارولا یا سوک کی چابی میری ناک کے سامنے لہرا کے کہے گا کہ بولو' یہ گاڑی چاہیے۔ ڈاکٹر صائمہ کی ننھی منی پیاری سی کار اس کی ڈکی میں آجائے گی۔ ہمیشہ تم اپنی کھٹارا موٹر سائیکل کو کک مارتے مارتے ہانپ جاتے ہو اور پھر جوتیاں چٹخاتے یا کسی بس کے ڈنڈے سے لٹک کے سفر کرتے نظر آتے ہو۔ تمہاری اکلوتی محبوبہ تمہارا دل رکھنے کے لیے بھی اس خطرناک سواری پر نہیں بیٹھی۔ کیا خیال ہے؟ یہ گاڑی تمہاری ہو سکتی ہے اگر..... اور میں ندیدوں کی طرح چابی کی طرف ہاتھ بڑھاؤں گا۔ پنگا میں نہیں لیتا' مفلسی کا عشق سب سے بڑا پنگا ہے اور میرا احساس کمتری جو مجھے ناجائز ذرائع سے دولت مند ہو کے شاہانہ محلوں میں رہنے والوں اور عالی شان گاڑیوں میں گھومنے والوں نے دیا ہے۔

شیر شاہ میں شیر شاہ کا مکان تلاش کرنا مشکل تھا۔ میں سیدھا اورنگی گیا جہاں اس نے ڈینٹر پینٹر ورکشاپ کھول رکھی تھی۔ اس آبادی کو جسے غالباً دنیا کا سب سے بڑا SLUM ہونے کا اعزاز حاصل ہے' انسان کی غربت میں جینے کی مجبوری اور بے چارگی اپنی انتہا پر نظر آتی تھی۔ رستم کو وہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں ایک گھنٹا لوگوں سے پتا پوچھتا رہا اور گلی گلی بھٹکتا رہا۔ لوگ شیر شاہ کو بھی نہیں جانتے تھے مگر کوئی مجھے بڑے یقین سے بتاتا تھا کہ ایک ڈینٹر پینٹر کی ورکشاپ ادھر ہے۔ میں وہاں جاکے دیکھتا تھا تو بھینسوں کا باڑا نظر آتا تھا۔

بالآخر میں نے وہ احاطہ تلاش کرلیا۔ احاطے کا گیٹ ٹین کا بنا ہوا تھا اور پورا کھلا ہوا تھا۔ احاطے میں ایک جلی ہوئی ویگن دوبارہ اصلی حالت میں نظر آنے کے انتظار میں تھی۔ تصادم میں جزوی طور پر مجروح ہونے والی دو گاڑیوں کے زخم مندمل ہو رہے تھے۔ ایک بس کا ڈھانچا ایسے نظر آتا تھا جیسے برسوں بعد قبر سے نکالا جانے والا مردہ مگر مجھے معلوم تھا کہ یہ بس کچھ عرصے بعد کراچی کی سڑکوں پر دھواں چھوڑتی مسافروں کے بوجھ سے لڑکھڑاتی ہانپتی نظر آئے گی۔

کاریگر یعنی وہ لڑکے جو سارا دن فولادی چادروں کو فولادی ہتھوڑوں سے ٹھوک پیٹ کے برابر کرنے کا شور سنتے تھے اور سطح ہموار کرنے کے لیے استر کو ریگ مال سے رگڑتے تھے' چھٹی کر کے جاچکے تھے۔ آخری حصے میں واقع کمرے کا دروازہ کھلا پڑا تھا چنانچہ میں نے اندر جھانک لینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اورنگی پولیس اسٹیشن اس جگہ سے بہت کم فاصلے پر تھا اور شاید انہی کی سرپرستی میں چوری ہونے والی گاڑیوں کے چیسس نمبر یہاں بدلے جاتے تھے۔ انجن بدلنے پر کوئی قانونی پابندی نہیں۔ کوئی بھی اپنی گاڑی میں نیا انجن لگوا سکتا ہے اور نئے انجن نمبر کا اندراج کاغذات میں کرا سکتا ہے مگر چیسس نمبر گاڑی کی شناخت ہوتا ہے۔ چیسس نمبر بدل جائے تو پرائی گاڑی اپنی ہوجاتی ہے۔ جس کا جی چاہے کاغذات سے ملا کے دیکھ لے۔ رجسٹریشن نمبر انجن نمبر چیسس نمبر سب ٹھیک ہے؟ جانے دو استاد۔

کمرے میں تاریکی تھی اور وہ بُو جو موٹر مکینکوں سے' ان کے لباس سے اور ماحول سے آتی ہے' ڈیزل پیٹرول' آئل اور گریز کی ملی جلی بُو۔ اِدھر اُدھر گاڑیوں کے پرزے اور اوزار بکھرے پڑے تھے اور دائیں جانب کی دیوار کے ساتھ پرانی میز پر سر رکھے کوئی سو رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھ کے اس نے ہاتھ بھی میز پر پھیلا دیے تھے اور

تھکن اس پر اتنی غالب آگئی تھی کہ وہ سو گیا تھا۔

میں نے کہا "شیر شاہ!" اور پھر دروازہ بجایا مگر اس نے حرکت نہیں کی تو میں قریب گیا۔ میری آنکھیں اب تاریکی میں دیکھنے لگی تھیں چنانچہ مجھے وہ خون فوراً نظر آگیا جو میز پر پھیلا ہوا تھا اور غالباً مرنے والے کے کٹے ہوئے حلق سے پھوٹا تھا۔

زمین میرے پیروں کے نیچے ہلنے لگی۔ میں نے میز کا کونا پکڑ لیا اور متلی کو روکنے کے لیے لمبے لمبے سانس لیے۔ شیر شاہ مرچکا تھا اور اسے مرے کافی دیر ہوگئی تھی کیونکہ خون کی سرخی پر سیاہی غالب آگئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا مگر احاطے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں آسانی سے فرار ہوسکتا تھا۔ کسی نے بھی مجھے یہاں آتے نہیں دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ مجھ پر قتل کا الزام آئے اور کوئی عینی شاہد نمودار ہو، مجھے بھاگ جانا چاہیے۔

اچانک میری نظر نے میز کی سطح پر شیر شاہ کے ہاتھ کو دیکھا۔ اس نے مرتے مرتے اپنے ہی خون سے کچھ لکھنے کی کوشش کی تھی۔ جھک کر دیکھنے پر میں اس شکستہ، بدوضع تحریر کے آپس میں مل جانے والے الفاظ کا مطلب سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ اس نے ایک نام لکھا تھا جو کوئی عام قسم کا نام نہیں تھا۔ آگاہی..... اور یہ علامہ اقبال کے شعر... جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی۔ والی آگاہی نہیں تھی جسے آگہی بھی لکھا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں یہ نام خیال آگاہی کا تصور بن کے ابھرا۔

فرار ہونے سے پہلے میں نے ایک جرم کیا۔ میں نے تھوڑا سا پانی ڈال کے اس خونی تحریر کو ایک دھبا بنادیا۔ اب میرے سوا کوئی بھی نہیں جان سکتا تھا کہ مرنے والے نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کے کیا لکھا تھا اور کیوں۔ میرے لیے یہ فرض کرنا ممکن نہیں تھا کہ خیال آگاہی نے یہ قتل خود کیا ہوگا۔ اس جیسی عورت کے لیے شیر شاہ کا گلا کاٹنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا میرے لیے قربانی کے بیل کو ٹانگ اڑا کے گرانا۔ جیسے بیل مجھے ناک آؤٹ کرکے میرے اوپر سے گزر جاتا ایسے ہی شیر شاہ بھی خیال آگاہی کو..... خیر، وہ اس کمرے میں آجاتی جہاں شیر شاہ اکیلا تھا تو بہت کچھ ہوسکتا تھا۔ تاہم اس قتل کے بارے میں میرے شبہات ایک واضح سمت اختیار کررہے تھے۔ میں نے صائمہ کو اسلام آباد روانہ کرکے غلطی نہیں کی تھی۔

جائے واردات سے فرار ہوکے میں نے دوسرا جرم کیا۔ میں پولیس کو قتل کی اطلاع دینے کا قانونی فرض ادا کرتا تو یہ آبیل مجھے مار والی بات ہوتی۔ شیر شاہ کی ورکشاپ سے کافی دور آکے میں نے اورنگی پولیس اسٹیشن کو اپنے موبائل فون پر قتل کی اطلاع دی۔ ایک کوڑھ مغز یا جان بوجھ کے گمنام کال کو نظرانداز کرنے کے خواہش مند ڈیوٹی افسر نے بڑی مشکل سے میری بات سنی اور سمجھی

"یہاں آکے رپورٹ لکھوا دو جی..." وہ بولا۔

میں نے کہا "تاکہ آج رات تم مجھ سے تفتیش کرو اور صبح تک آلۂ قتل بھی برآمد کرلو۔"

"ہمیں کیا پتا تم نے تنگ کرنے کے لیے فون کیا ہو۔ اُدھر جائیں تو لاش پڑی ہو کسی کتے بلی کی۔"

"میں ایک اخبار کے دفتر بھی فون کروں گا اور انہیں بتادوں گا کہ تم نے کیا جواب دیا تھا..." میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

میں اب پہلے سے زیادہ ڈپریشن کا شکار تھا۔ دنیا میری نظروں میں ہیچ ہوگئی تھی۔ مجھے یقین آنے لگا تھا کہ پانچ لاکھ جو مجھے مل چکے ہیں، میری آخری رسوم اور میرے مزار شریف کی تعمیر میں ہی استعمال ہوں گے اور میں نے خیال آگاہی کو مذاق میں جو دعوت دی تھی وہ سچ مچ ہوگی۔ پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگی۔ تین قتل ہوچکے تھے۔ میرا نمبر چوتھا بھی ہوسکتا تھا اور ڈاکٹر صائمہ کا مشن کامیاب رہا تو پانچواں۔

میں بے خیالی میں آفس کے سامنے سے گزرا اور اچانک دنیا میں سب کچھ لال ہوگیا۔ مجھے روشنیاں، انسان اور عمارتیں لال نظر آنے لگیں۔ لال رنگ میری آنکھوں میں پھیل گیا تھا۔ کاجل کی سیاہی کی طرح جیسے میں نے آنکھوں میں لال لپ اسٹک لگائی ہو۔ میرا چہرہ لہولہان نظر آرہا ہوگا۔ کچھ لوگ ہنسنے لگے۔ کچھ تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میں حادثے کا شکار ہوا ہوں یا قاتلانہ حملے کا۔

میں اوپر پہنچا اور نقشِ فریادی بن کے توپ صاحب کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ انہوں نے غور سے دیکھا "بھئی صاحبان، آپ ہی بتائیے.... کیا قصوروار ہم ہیں۔ اتنی بلندی سے اپنے پرائے کا فرق دیکھ سکتا ہے کوئی۔ عمر کے باعث نظر میں بھی فتور آگیا ہے۔"

میں نے اسٹیمپ پیڈ پر ڈالی جانے والی لال روشنائی کی شیشی اٹھائی اور ٹوپی ہٹا کے توپ صاحب کے سر کی شفاف سطح پر انڈیل دی "فتور یہاں ہے توپ صاحب!" لال رنگ بہہ کے چہرے، گردن، ان کی آستین اور دامن پر پھیل گیا۔

پائندہ خان نے کہا "ابھی تم ایک جان دو قالب ہوگئے۔"

انہوں نے آہ بھر کے ٹوپی سر پر رکھی اور دہلی کے کاتب کو خشمناک نظروں سے دیکھ کر کہا "جواہر لال ولد موتی لال۔ صبح ہمیں ڈرائی کلین ہونے کے لیے دے دینا۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ وہ رات روزنامہ خبرساز کے آفس میں زندہ رہ کے گزاروں۔ اپنے فلیٹ میں وہ میری زندگی کی آخری رات بھی ہوسکتی تھی۔ دفتر کا ایک حصہ توپ صاحب کا بیڈروم تھا جسے وہ اپنا مدفن کہتے تھے۔ دفتر ان کے لیے میدان حشر تھا۔ مردہ مدفن سے کہاں جائے گا؟ میدانِ حشر کی طرف۔ سارے گنہگار جمع ہیں یہاں۔

ایک گھنٹے تک میں کروٹیں بدلتا رہا اور کھٹمل بڑے اطمینان سے میرا خون چوستے رہے۔ میری نظروں کے سامنے شیر شاہ کی لاش آجاتی تھی۔ ایک متحرک ہاتھ کی انگلی جس سے خون ٹپک رہا تھا

دیوار پر رینگنے لگتی تھی۔ میں منہ دوسری طرف کرلیتا تھا۔ وہ لہو کی تحریر دوسری دیوار پر نمایاں ہو جاتی تھی۔ آگاہی..... خیال آگاہی۔ فخرالنسا بیگم۔

رات بارہ بجے میری جیب میں موبائل کی گھنٹی بجی۔ "کیا کررہے ہو؟" صائمہ نے بڑی شگفتگی سے سوال کیا۔

"ملک الموت کا انتظار" میں نے کہا "اور تم؟"

"میں ڈنر کررہی ہوں۔ ایک پرانا کلاس فیلو مل گیا۔ ایف آر سی ایس کرچکا ہے' اس نے مدعو کرلیا۔ بہت اسمارٹ ہوگیا ہے لندن میں رہ کے۔ ابھی تک شادی بھی نہیں کی۔ کہہ رہا تھا کہ تم جیسی کوئی ملی نہیں..."

میں نے کہا "ڈاکٹر صائمہ' میری مانو تو اسی سے شادی کرلو۔ واپس مت آؤ۔ اس جنم میں ہمارا بچھڑنا طے ہے۔ عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن' کل پانچواں دن ہوگا۔ ویسے بھی ہماری جوڑی ایسی نہیں تھی کہ لوگ کہیں چاند سورج کی جوڑی۔ گلی ڈنڈا کہتے ہیں سب۔ تمہارا بھی قد اتنا ہی رہے گا اور میرا بھی۔ وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ ضرور حاصل کرلینا کل۔"

"اچھا!" اس نے ہنس کے فون بند کردیا اور میں نے ایک آہ بھری "روتے ہیں چھم چھم نین...."

توپ صاحب سرخ رو نمودار ہوئے "یار' تم بڑے بزدل ہو۔ بھئی اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔ مجھے بتاؤ' یہ حرام الدہر اولادِ خر میکا سا کون ہے؟ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ سمجھاؤ اسے' دس کے بیس نہیں لے گا ان سے بھی جائے گا.... یہاں کون ہے حب الوطن اور جو ہے اسے کیا ملتا ہے سند کے طور پر؟ جوتیوں کا ہار۔"

"اس نے.... فون کیا تھا آپ کو؟" میں اٹھ بیٹھا اور پھر انہیں الف سے زیڈ تک سب کچھ بتادیا۔ وہ اپنے سر اور چہرے کو واش بیسن میں صابن سے اور رنگ کاٹنے والے محلول سے دھوتے ہوئے میری بات سنتے رہے۔ باربار اچھلتے رہے اور دم بخود ہوتے رہے۔ "اچھا؟ یہ بات ہے! واقعی..... بھئی حد ہوگئی" جیسے الفاظ خود بخود ان کی زبان سے نکلتے رہے۔

سر کو تولیے سے رگڑتے ہوئے انہوں نے آئینہ دیکھا۔ "تم کہیں سے وہ حاصل کرلو۔ سلیمانی ٹوپی' جسے پہن کے آدمی غائب ہوجاتا ہے ورنہ وہ لگا ہوا ہے تمہارے پیچھے سائے کی طرح۔ شرط لگالو اس وقت بھی کہیں نیچے موجود ہوگا سیاہ رو..... رنگ خاصا اترگیا ہے اب تو۔"

"حبشی کبھی انگریز نہیں ہوسکتا اور اس کے تو اعمال بھی سیاہ ہیں۔"

"میں اپنے سر عزیز کی بات کررہا تھا عزیزِ من!" توپ صاحب بولے "معلوم ہے اس نے مجھ سے فون پر کیا کہا؟ کہنے لگا کہ میں بزدل کی طرف سے شیر شاہ کی قبر پر پھولوں کی چادر ڈلوادوں گا۔"

میں گھبرا کے اٹھا اور پھر بیٹھ گیا "وہ..... وہاں بھی تھا۔ حرام زادہ..... دھمکی دیتا ہے مجھے کہ پولیس کو بتادوں گا..... کہ میں نے شیر شاہ سے ملاقات کی تھی مگر اسے میں نے قتل نہیں کیا تھا۔"

توپ صاحب سوچ میں پڑگئے "اچھا.... قسم کھاؤ ہمارے سر کی جو لال تربوز لگ رہا ہے.... قتل کیا ہے تو بتادو' ہم کچھ نہیں کہیں گے تمہیں۔"

میں نے کہا "میں سونا چاہتا ہوں گھوڑے بیچ کے مگر اس کے لیے گھوڑے نہیں' نیند کی گولیاں چاہئیں۔"

توپ صاحب نے پان منہ میں رکھا' بٹوا کھول کے دیگر لوازمات پھانکے اور ایک گولی مجھے پیش کی "اتفاق سے ایک ہی پڑی تھی نہ جانے کب سے۔ اسی لیے کہتے ہیں نا.... داشتہ آید بہ کار۔"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے جھوٹ بولا تھا اور مجھے ایک اینٹی الرجک گولی دے دی تھی جو دیکھنے میں ویلیم فائیو لگتی تھی۔ اس کا اثر نفسیاتی تھا' جب میری آنکھ کھلی تو مجھے توپ صاحب صوفے پر سوالیہ نشان والے پوز میں سوتے نظر آئے۔ یہ تکلیف انہوں نے میری وجہ سے اٹھائی تھی۔ ساتھ والے کمرے میں پائندہ خان بھی فرش کے قالین پر چادر بچھائے تکیہ ڈالے سو رہا تھا۔

مجھے اپنے فلیٹ میں جاتے ہوئے خوف آتا تھا۔ میں نے اوپر ہی سے سڑک کا جائزہ لیا۔ دس بجے دنیا اپنے آدھے کام نمٹا چکی تھی' یہاں تک کہ ہاکر بھی روزنامہ "خبرساز" بیچ کے فارغ ہوگئے تھے۔ ٹریفک اور لوگوں کی گہما گہمی میں مسٹر میکا سا کی صورت سے پہلے ان کی گاڑی تلاش کرنا آسان تھا مگر وہ سیاہ کار مجھے کہیں بھی نظر نہ آئی۔

برنس روڈ پر پوری چھولے کھاتے ہوئے بھی میری نظر گاڑیوں پر رہی اور مجھے یہ خیال رہا کہ ابھی اچانک مسٹر میکا سا میرے سامنے آکے بیٹھ جائیں گے اور پوچھیں گے' پھر آپ نے کیا سوچا ہے سر' اس وقت مجھے ایک ریوالور کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ میرا رول ایک فلمی جاسوس کا ہوگیا تھا مگر میں خالی ہاتھ تھا اور مجھے کوئی مارشل آرٹ بھی نہیں آتا تھا۔

میں ٹیکسی میں پولیس اسٹیشن پہنچا تو حسبِ توقع ایس ایچ او صاحب گشت پر تھے۔ اس کے آفس میں جو کسی طرح بھی ڈی آئی جی کے آفس سے کم نہ تھا' گھومنے والی کرسی پر بیٹھ کے اور لاتیں میز پر رکھ کے میں نے ایک حوالدار کو چائے لانے کا حکم دیا "اسپیشل مگر دودھ کے بغیر....."

اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا "یس سر.... چائے کے پیسے..."

میں نے فون اٹھالیا "میں کہتا ہوں ظالم خان سے۔ وہ چیک کاٹ دے گا۔"

حوالدار نے گھبرا کے کہا "جی.... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" اور رفوچکر ہوگیا۔ میں نے ظالم خان سے موبائل پر بات کی۔

"مجھے ایک توپ چاہیے.... توپ نہ سہی مشین گن۔ میں یہاں تمہارے آفس میں ہوں۔"

"میں شام سے پہلے نہیں آسکتا" وہ بولا۔

"چلو ایک کلاشنکوف دلوادو..... کم سے کم ریوالور ہی ہو۔ بغیر لائسنس کا۔" میں نے کہا "اپنی حفاظت کے لیے۔"

اس نے کہا "میری دکان نہیں ہے اسلحے کی۔"

میں نے کہا "ہر تھانے کے مال خانے میں اسلحہ ایکٹ کے تحت مقدمہ بنانے کے لوازمات ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے تم سب رکھتے ہو اپنے پاس..."

"اچھا' سب ہے میرے پاس مگر تمہیں کیوں دوں؟ پاگل کتے نے کاٹا ہے مجھے کہ ایک اخبار والے کو تھانے سے بغیر لائسنس کا اسلحہ فراہم کروں؟ تمہارا وہ یار جو ٹریفک پولیس میں سب انسپکٹر ہوگیا ہے بیس سال بعد.... جو تمہارے ساتھ بیٹھ کے جوا کھیلتا ہے..... وہ کردے گا تمہارا کام۔"

میں نے کہا "وہ فراخ دل آدمی ہے' کنجوس نہیں ہے تمہاری طرح۔"

"سب معلوم ہوگیا ہے مجھے۔ اس کی کوٹھی بھی دیکھی ہے میں نے اور کار بھی۔ اپنے بیٹے کی سالگرہ اس نے اتنی دھوم دھام سے کی تھی کہ اس میں دس لڑکیوں کی شادی ہو جاتی..... وہ جدی پشتی رئیس ہوتا تو بیس سال ٹریفک کنٹرول کرنے کے لیے چوک میں نہ ناچتا.... کہاں سے آیا اتنا پیسہ اس کے پاس؟"

"کبھی میں نے تم سے حساب مانگا ہے؟" میں نے کہا "احتجاجاً میں تمہارے خرچ پر چائے پی کے جارہا ہوں۔"

سب انسپکٹر عاقل خان کے بارے میں انسپکٹر رحم دل خان کے انکشافات میرے لیے نئے تھے۔ وہ جوا کھیلتا تھا تو سو روپے ہارتے ہی اٹھ جاتا تھا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اس سے زیادہ کا تپڑ نہیں۔ وہ رہتا بھی ایک فلیٹ میں تھا جیسا کہ اس نے مجھے بتایا تھا۔ اس کا لباس بھی زیادہ رئیسانہ نہیں ہوتا تھا۔ اسے میرے حلقۂ شناسائی میں داخل ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔

میں نے چائے پیتے ہوئے عاقل خان کو فون کیا "مجھے کام ہے تم سے۔"

عاقل خان نے کہا "یار' تم کہاں ہو؟ میں خود تمہیں تلاش کرتا پھر رہا تھا' مجھے بھی کام ہے تم سے۔"

"چلو پھر میں اپنے فلیٹ پر آجاتا ہوں" میں نے کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی اور ایس ایچ او صاحب کے معاون خصوصی حوالدار سے سواری کی فرمائش کی۔ اس نے تھانے میں پکڑی جانے والی موٹر سائیکلوں کو دیکھا اور پھر ایک مسکین صورت نوجوان کو حکم دیا کہ صاحب کو گھر چھوڑ کے واپس آؤ فوراً۔ تمہارے کاغذات یہیں ہیں۔ میری مداخلت پر نوجوان کو کاغذات بھی مل گئے اور تھانے سے گلوخلاصی پر وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے بیس منٹ کا فاصلہ دس منٹ میں طے کرکے کہا "اور کوئی حکم سر!" اور میرا جواب سننے سے پہلے فرار ہوگیا۔

عاقل خان وہاں پہلے سے موجود تھا اور میری موٹر سائیکل کے ڈھانچے کو دردناک نظروں سے دیکھ رہا تھا جو دیوار کے سہارے دو مہینے سے ایسے ہی پڑی تھی۔ ایک اسپیشلسٹ اس مردے میں جان ڈالنے کے لیے اس کے سارے پرزے دوسری موٹر سائیکلوں سے نکال کے بدل رہا تھا اور قیمت مجھ سے وصول کررہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ پھر کرۂ ارض پر بحرِ ظلمات کے گھوڑے کی طرح دوڑتی نظر آئے گی۔

میرے فلیٹ میں پہنچ کے عاقل خان نے ناک سے سوں سوں کی "یہ بدبو کیسی ہے۔ کوئی چوہا مرگیا ہے غالباً۔"

بدبو فریج میں سے آرہی تھی جو دو دن پہلے میں نے برف پگھلانے کے لیے بند کیا تھا "عاقل خان۔ مجھے ایک اصل ریوالور چاہیے" میں نے فریج سے سڑنے والی اشیا کو کھڑکی سے باہر پھینکا۔ ہر شخص اپنے گھر کا کوڑا کچن کی کھڑکی سے گراتا تھا اور جمعدار نیچے سے سب سمیٹ لیتا تھا۔ اس میں دونوں کی سہولت تھی۔

"ریوالور.... مل جائے گا.... چار ہزار میں۔"

میں نے کہا "مجھے دو چار دن کے لیے چاہیے۔ اپنی حفاظت کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور آج کل میرے حالات کچھ خطرناک ہوگئے ہیں۔"

اس نے جیب سے نکال کے سگریٹ جلائی "تمہارے سارے حالات کا مجھے علم ہے اور خطرات کا بھی۔ یہ مت پوچھنا کہ کیسے..... تم اخبار والے اپنے ذرائع استعمال کرکے بال کی کھال نکال سکتے ہو تو ہم پولیس والے بھی ہر بات معلوم کرلیتے ہیں۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "کیا معلوم ہوا ہے تمہیں؟"

اس نے بڑے یقین سے کہا "تم پچاس لاکھ کا ایک سودا کرارہے ہو جس میں دس لاکھ تمہیں ملیں گے لیکن تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ تم نام کے ہی نہیں' سچ مچ بزدل ہو۔ ریوالور تمہاری خاک حفاظت کرے گا' تمہاری حفاظت میں کرسکتا ہوں۔"

"تم..... وہ کیسے؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑدو۔ پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی" وہ مسکرایا۔

میں نے کہا "تم جانتے ہو نا انسپکٹر رحم دل خان اور میں لنگوٹیے ہیں۔ بچپن میں ایک دوسرے کی لنگوٹی اتار دیتے تھے سرِعام۔ اب بھی اتارتے ہیں' میں نے اسے انکار کردیا۔ اسلام آباد کا ایس پی ایک اشارہ کرے تو یہاں کا ایس پی توپ لے کر میرے پیچھے چلے یا دروازے پر بیٹھا رہے مگر میں پولیس کو سات سلام کرتا ہوں۔"

"تم سمجھ نہیں رہے ہو' صورتِ حال کی سنگینی کو..."

میں نے طنز سے کہا "اور تم مجھ سے زیادہ سمجھتے ہو؟"

"ہاں۔ اس لیے کہ.....میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ کون ہیں‘ جن سے تمہارا معاملہ چل رہا ہے۔ رقم تو مل گئی ہوگی تمہیں؟"

میں نے ایک مصنوعی قہقہہ مارا "ویری گڈ۔ یہاں سے اسلام آباد تک جو بات کسی الو کے پٹھے کو معلوم نہیں‘ وہ تم جانتے ہو؟"

"یہ مذاق نہیں ہے.....یہ بتاؤ رقم فراہم کردی ہے انہوں نے...؟"

"تھینک یو عاقل خان۔ مجھے تمہاری خدمات کی بلکہ دخل اندازی کی قطعی ضرورت نہیں۔"

"تو کیا دس لاکھ تم اکیلے ہی ہضم کرجاؤ گے..." وہ بولا۔

"کیا مطلب؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"مطلب یہ کہ.....یاروں کا حصہ بھی نکالو۔ ایک چوتھائی مجھے دے دو اور بے فکر ہوجاؤ" وہ کمینگی سے بولا "رقم کہاں ہے؟"

میں نے خاموشی سے دروازہ کھولا "گیٹ آوٹ عاقل خان۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے لالچی ہو۔ آج ہی مجھے رحم دل خان نے بتایا ہے کہ تم کیا چیز ہو۔ پولیس بھی صحافیوں کو بخش دیتی ہے۔ تم تو دوست بھی تھے‘ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی....اور رقم کا ابھی کچھ پتا نہیں۔"

وہ احساس ذلت کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ "ساڑھے سات لاکھ بھی بہت تھے تمہارے لیے....تمہاری جان بچ جاتی۔"

میں نے دروازہ بند کردیا "اللہ مجھے بچانے والا ہے۔ تم اب خود کو بچانے کی سوچو۔ لوٹ کا سارا مال نکلوا کے چھوڑوں گا میں تم سے.....اب آئی بات سمجھ میں کہ بیس سال تک تم نے ترقی کیوں نہیں کی۔ تم سڑک پر وردی پہن کے آتے جاتے لوگوں کو لوٹتے تھے۔ اب ہیڈ آفس میں پوسٹنگ ہوئی ہے تو ڈھائی لاکھ مجھ سے وصول کرنا چاہتے ہو۔ کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے آخر؟ ایک کالم لکھ دیا‘ ایک قطعے میں نام ڈال دیا تو کندھے سے پھول غائب ہوجائے گا۔"

جب میرا غصہ اتر گیا تو میں نے اپنے کباڑ خانے کی حالت کو کچھ سنوارنے کی کوشش کی۔ میں نے میلے کپڑے‘ پرانے اخبار‘ چائے کے کپ اور سالن کی پلیٹوں کو سامنے سے ہٹایا۔ بستر کی چادر جھاڑی اور فرنیچر کو ترتیب سے رکھا۔ ایک گھنٹے میں یہاں ڈاکٹر صائمہ پہنچ رہی تھی۔ میں صفائی کی اہمیت اور ڈسپلن کی ضرورت پر اس کا لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ مزید یہ کہ شام چھ بجے تک مسز خیال آگاہی کے کسی نمائندے کا پچاس لاکھ کی رقم کے ساتھ نمودار ہونا بھی یقینی تھا۔ وہ خود خیال آگاہی بھی ہوسکتی تھی۔ عاقل خان کی باتوں نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ جو بات میں نے راز رکھی تھی‘ وہ اسے معلوم ہوگئی تھی۔ خیر جو بات دس آدمی جانتے ہوں وہ گیارہویں سے بارہویں تک بھی پہنچ جاتی ہے مگر عاقل خان کی نیت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ ادھر ادھر ایسے دیکھ رہا تھا جیسے پچاس لاکھ میں نے فلیٹ میں ہی کہیں چھپا رکھے ہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ ساری عمر موٹر سائیکل والوں کو روک کے سو پچاس لیتے‘ تفریحی مقامات پر پھرنے والوں سے نکاح نامے مانگ کر دو چار سو وصول کرنے یا رات کو ائرپورٹ سے آنے والوں کی تلاشی کے بہانے انہیں لوٹ کے عاقل خان نے جو دولت اکٹھی کی تھی‘ وہ قطرہ قطرہ مل کے دریا بنی تھی۔ اسے میرے ڈھائی لاکھ بہتی گنگا نظر آتے تھے جس میں ہاتھ دھوکے وہ ڈھائی لاکھ راتوں رات وصول کرسکتا تھا۔ اسے صدمہ تھا یا حسد تھا کہ اتنا پیسہ جمع کرنے میں اسے کئی سال لگ جاتے تھے جو میں چند دن میں کما رہا تھا اور بُرا بنے بغیر۔ یہ حرام کی کمائی نہیں تھی۔ مجھے نیک نیتی کی سند بونس میں مل رہی تھی۔ بزدل کہلانے کے باوجود میری بہادری کے چرچے تھے۔

کیا پتا وہ پچاس لاکھ کے لیے مجھے ابھی قتل کردیتا۔ اگر میں اسے بتادیتا کہ رقم وصول ہوگئی ہے۔ ذلیل آدمی دوستی کے نام کو ذلیل کرتا ہے۔ اس سے محتاط رہنا ضروری ہے۔

گھنٹی بجی تو میں نے گھڑی دیکھی اور پھر ایک کونے میں پڑا ہوا کرکٹ کا بیٹ اٹھا کے دروازہ کھولتے ہی سائڈ میں کھڑا ہوگیا۔

صائمہ نے اندر قدم رنجہ فرماتے ہی میرا چھکا مارنے والا پوز دیکھا تو اس کا موڈ زیادہ خراب ہوگیا "ہاں۔ پھاڑ دو میرا سر۔ تمہارے پاس ایک متبادل محبوبہ جو ہے۔ ائرپورٹ کیوں نہیں آئے مجھے لینے۔"

میں نے بیٹ کونے میں رکھ دیا "تمہاری صابن دانی ائرپورٹ پر موجود تھی۔ اسے ڈرائیو کرکے تم آدھے گھنٹے میں آگئی ہو۔ میں ٹیکسی میں پہنچ جاتا تب بھی مجھے واپسی میں مرغا بن کے آنا پڑتا۔"

اس نے فلیٹ پر ایک نظر ڈالی "بڑی صفائی نظر آرہی ہے۔"

میں نے کہا "آئی تھی وہ متبادل محبوبہ۔ وہ سارا کام کرگئی۔ میرے منع کرنے کے باوجود۔ تم سناؤ۔"

اس نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا جس میں ایک انگوٹھی جگمگا رہی تھی "میں نے بھی وہی کیا جو تم چاہتے تھے۔ کیسی ہے منگنی کی انگوٹھی؟"

میں نے کہا "پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھنے کے بعد بتاؤں گا۔"

اس نے بیگ میں سے رپورٹ نکالی "تمہارا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ یہ حادثہ راولپنڈی اور پشاور کے درمیان سنگ جانی کے قریب پیش آیا تھا۔ وہاں ایک پولیس چوکی ہے۔ انہوں نے راولپنڈی کے سینٹرل گورنمنٹ اسپتال سے ایمبولینس منگوائی اور لاش کو گاڑی سے نکالا۔ کار کے حادثے کا سبب کچھ بھی نہیں۔ سنگ جانی چوکی والوں کا خیال تھا کہ گاڑی موڑ پر قابو سے باہر ہوگئی۔ وہاں دو پہاڑیاں سی ہیں۔ ٹیلے سمجھ لو‘ سڑک درمیان سے گزرتی ہے۔ ایک ٹیلے پر کسی انگریز کی یادگار بنی ہوئی ہے۔ اشوک کی لاٹ جیسی۔ ایک سیدھا ستون کھڑا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "مگر وہ تھا کون؟"

صائمہ نے کہا "میں ذرا تھک گئی ہوں۔ کافی پی کے باقی بات

بتاؤں گی۔"

میں نے دانت پیستے ہوئے اسے زیرلب ایک گالی دی اور بجلی کی کیتلی کا پلگ لگادیا "پلیز سویٹ ہارٹ، سسپنس پیدا مت کرو۔"

وہ میرے بیڈ پر جوتوں سمیت دراز پیر ہوتی رہی اور ایک ایسے میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی جو ذرا بھی زنانہ نہیں تھا۔ خواتین کی سنسنی خیز تصاویر سے بھرا ہونے کے باوجود، اب اس نے مجھے شرمندہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

میں نے رسالہ چھین کے ایک طرف پھینکا "پاکیزہ ڈائجسٹ پڑھا کرو ڈاکٹر صائمہ۔ آگاہی کون تھا؟"

"خیال آگاہی کا شوہر!" صائمہ نے اٹھ کے آئینے میں اپنے بال سنوارے اور لپ اسٹک ٹھیک کی "ایک ایرانی نوجوان جس نے شادی کے بعد پاکستانی شہریت حاصل کرلی تھی۔ اصل نام تھا جمال الدین قطبی مگر بحیثیت مصور لوگ اسے جمال آگاہی کے نام سے جانتے تھے۔ وہ کمال کا فن کار تھا۔"

"خیال آگاہی نے اس کی بنائی ہوئی تصویروں سے شہرت حاصل کی اور پھر افشائے راز کے خوف سے اسے مروادیا؟"

"شرلاک ہومز مت بنو بلاوجہ!" اس نے مجھے ڈانٹا "خیال آگاہی خود ایک نامور مصورہ تھی، شادی سے پہلے بھی۔ جمال آگاہی فن کے معاملے میں بہت آگے تھا مگر وہ انقلاب کے بعد بھاگ کر آیا تھا اور انقلاب دشمن شمار ہوتا تھا۔ وہ روپوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ خیال آگاہی جو شادی سے پہلے فخرالنسا بیگم تھی اور تصویروں پر صرف خیال لکھتی تھی، اس سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ ایک ہینڈسم آدمی تھا.... اور جینئس۔"

"میری طرح!" میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے.... مگر اس کا قد بھی انسانی تھا" صائمہ نے کہا "اس کی موت حادثاتی معلوم ہوتی تھی مگر پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہوگیا کہ وہ حادثے کے وقت سے بہت پہلے مرگیا تھا اور اس کی موت کی وجہ تھی۔"

"کیا وجہ تھی؟" میں نے سانس روک کے پوچھا۔

"ہیروئن!" اس نے یوں اعلان کیا جیسے ٹی وی کے پروگرام نیلام گھر میں طارق عزیز کسی مہمان کی آمد کا اعلان کرتا ہے "مہربان، قدردان۔ صاحبان! وہی ہیروئن جو اس کیس میں.... دو افراد کے قتل کا سبب بن چکی ہے۔ ایک خانس آرٹ گیلری کا چوکیدار اور دوسری اس کی بیوی۔ جمال آگاہی کو ہیروئن کی بہت زیادہ مقدار دے کر ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کے دونوں بازو چھلنی ہوئے پڑے تھے۔ وہ نہ جانے کب سے انجکشن لے رہا تھا۔"

میں نے کہا "شرلاک ہومز کا معاون اس کا دوست ڈاکٹر واٹسن تھا۔ ڈاکٹر تم بھی ہو چنانچہ مجھے شرلاک ہومز ثانی کہلوانے کا حق حاصل ہے۔ غور طلب مسئلہ یہ ہے ڈاکٹر کہ میرے قتل کا سبب ہیروئن نہیں ہوسکتی۔ فلمی ہیروئن بھی نہیں حالانکہ تم کسی سے کم نہیں۔ اسٹنگر میزائل اور ہیروئن کا آپس میں کیا تعلق ہوسکتا ہے؟"

"خیال آگاہی اس پر سرچ لائٹ ڈال سکتی ہے۔"

میں نے کہا "آہ۔ وہ حسین بیوہ!" میں نے دکھی لہجے میں کہا "وہ بھی آنے ہی والی ہے مگر اس سے پہلے مجھے جوش رقابت میں کچھ کرنا چاہیے۔ محبوبہ نمبرون۔ غصے میں تھر تھر کانپتے ہوئے میں سوال کرتا ہوں کہ تم نے یہ منگنی کی انگوٹھی کیسے پہن لی۔ کیوں نہ اپنی اولین فرصت میں اس رقیب روسیاہ کو قتل کردوں میں؟"

"کردینا!" وہ بے پروائی سے بولی اور ہاتھ پھیلا کے انگوٹھی کو تعریفی نظروں سے دیکھنے لگی "مگر تمہیں فرصت کہاں ملے گی۔ اس نے مجھے پیشکش کی تو میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے پہن لی، اصلی ہیرا ہے۔"

میں نے میز پر مکا مارا "کل کو وہ تم سے پوچھے گا کہ مجھے قبول کیا تو اس کا دل رکھنے کو تم کہہ دوگی کہ ہاں۔"

"کل تو وہ امریکا جارہا ہے۔ بیوی بچوں کے پاس..... وہ سیٹل ہوگیا ہے وہاں۔ دو سال بعد آیا تھا ماں کے مرنے پر۔"

دروازے کی گھنٹی بجی تو میں نے کہا "پستول.... ریوالور.... کچھ ہے تمہارے پاس۔ کلاشنکوف.. بم.... اسٹنگر میزائل۔ کچھ بھی نہیں تو یہ جھاڑو اٹھالو، بیٹ ذرا بھاری ہے۔"

دروازہ کھولتے ہی میں نے خیال آگاہی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ اتنا ہی شگفتہ مگر جذبات سے یکسر عاری تھا۔ اس کے پاس ایک خاصا بڑا سوٹ کیس رکھا ہوا تھا۔ دوسرا ویسا ہی سوٹ کیس ٹیکسی ڈرائیور اٹھا کے لارہا تھا اور اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ خیال آگاہی نے اسے دوسو روپے دیے مگر وہ پھر بھی زیادہ خوش نہیں ہوا۔ میرے حساب سے کرایہ سو روپے بنتا تھا اور اسے اتنی ہی ٹپ مل گئی تھی۔

جب میں سوٹ کیس اٹھا کے اندر لے گیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ پچاس لاکھ کے نوٹ کتنے بھاری ہوتے ہیں۔ دونوں سوٹ کیس دو من وزنی ضرور تھے۔ ایک ہاتھ میں ایک من وزن اٹھا کے چلنا بھی مشکل تھا۔ اگر مجھے بھاگنا پڑا تو کیا ہوگا۔ میں نے لرز کے سوچا۔

پچاس لاکھ کا تصور ہی مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے بہت تھا۔ جس شہر میں پانچ ہزار کے لیے مسلح افراد گھر میں داخل ہو کے مزاحمت کرنے والے کو گولی ماردیتے ہوں، وہاں ایک معمولی کرائے کے فلیٹ میں اتنے بڑے خزانے کی خبر پا کے تو سارے شہر کے ڈاکو آسکتے تھے۔ دو ڈاکو پہلے سے اس کی تاک میں تھے اور انہیں معلوم تھا کہ یہ رقم اس وقت تک میرے پاس رہے گی جب تک کہ اسے وصول کرنے والے طلب نہ کریں۔ ان میں ایک مسٹر میکا سا تھا اور دوسرا مارِ آستین عاقل خان۔

اچانک خطرے کا احساس میرے اعصاب پر سوار ہوگیا تھا۔ خود صائمہ کا رنگ اڑا ہوا تھا اور جب خیال آگاہی سے تشریف

رکھنے کی درخواست کرنے کے بعد میں نے صائمہ سے کہا کہ وہ مہمان کے لیے کافی بنائے اور کچھ کھانے کو لائے تو وہ ایسے چونکی جیسے میں نے اسے قطب شمالی سے آئس اور قطب جنوبی سے کریم لانے کو کہا ہے پھر وہ بدحواسی میں کچن کی طرف گئی تو ایک سائڈ ٹیبل سے ٹھوکر کھا کے گرتے گرتے بچی۔ کچن میں اس نے تھرماس فلاسک گرایا اور اس کی بوتل پھٹنے سے دھماکا ہوا۔ میری طرح اس کے ہاتھ پاؤں بھی قابو میں نہ تھے۔

'یا میرے مولا' میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ اپنے تہی دست بندے کو قاتلوں' ڈاکوؤں سے بچانے والا صرف تو ہے۔

خیال آگاہی نے کہا "آپ کی پھر بات ہوئی کسی سے؟"

میں نے کہا "ہاں.... پتا نہیں کس کس سے..... ابھی عاقل خان آیا تھا۔ صائمہ سے بھی بات ہوئی..... بیوی ہے میری..... منگنی کی انگوٹھی پہنادی کسی اور نے..."

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "میں ان کی بات کر رہی تھی..."

میں نے خود کو سنبھالا "جی..... جی ہاں' ہوگئی' بالکل ہوگئی۔"

"میرا ارادہ ہے شیرٹن یا ہالیڈے اِن میں قیام کا۔ جہاں بھی جگہ ملی" خیال آگاہی نے کہا "کب تک امید رکھوں میں؟"

"امید..... آپ امید سے ہیں..... میرا مطلب ہے امید پر دنیا قائم ہے۔ میں بھی امید سے ہوں..... مجھے امید ہے بہت جلد..... لیکن میرا مشورہ ہے کہ وقت کا انتظار مت کریں..... آپ کی چیز پہنچ جائے گی' بشرطِ زندگی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل واپس چلی جاؤں گی۔"

کافی پینے کے بعد خیال آگاہی نے ڈاکٹر صائمہ کی پیش کی ہوئی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی تو مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اعترافِ جرم سے کم نہیں تھے۔ اس نے مان لیا کہ اس کا شوہر جمال آگاہی بہت عرصے پہلے اس لت کا شکار ہوا تھا۔

میں نے کہا "بہت عرصہ کہنے سے کچھ واضح نہیں ہوتا۔"

"تقریباً تین چار ماہ پہلے۔" خیال آگاہی نے پہلو بدل کے کہا "اگر وہ اس لعنت میں مبتلا نہ ہوتا تو بہت بڑا مصور ہوتا۔ اس نے ایک ایک کرکے اپنی ساری تصاویر اونے پونے فروخت کردیں۔ یہاں اسے کام کرنے کے اچھے مواقع ملے' وہ اس نے ضائع کردیے۔ وہ باہر بھی جاسکتا تھا مگر ڈرتا تھا۔ یہ پوسٹ اسے آفر ہوئی تھی جہاں میں کام کررہی ہوں مگر وہ سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس نے یہاں مجھے رکھوادیا۔ تاج بخت خان نے اس کی بات مان لی۔"

میں نے کہا "شوق کے لیے تو قارون کا خزانہ بھی کم پڑجاتا ہے۔ جب ساری تصاویر بک گئیں تو جمال آگاہی کا خرچ کیسے پورا ہوتا رہا..."

"جو کچھ میں کماتی تھی۔ وہ بہت کم تھا" اس نے نظر جھکالی۔ "میرے پاس اپنا بچایا ہوا کچھ پیسہ تھا' وہ بھی ناکافی ثابت ہوا۔ میں کیا کرتی.... میں مجبور تھی۔ ایک فلیٹ بک کرایا تھا میں نے کراچی میں۔ آدھی ادائیگی ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب اسے بیچ دوں۔ ایسا نہ کیا تو طلب کے ہاتھوں مجبور ہوکے جمال نہ جانے کیا کرے.... مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔"

"اس سے پہلے ہی وہ مارا گیا؟"

"نہیں۔ اس کو ہیروئن ملنے لگی۔ نہ جانے کہاں سے..... اس نے کہا کہ اب مجھے اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کے دوست اور قدرداں ہیں جنہوں نے یہ ذمّے داری قبول کرلی ہے۔ قدرداں اور دوست' مائی فٹ۔ اس کی جان لینے والے وہی تھے۔ انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ جمال سے اس کی یہ عادت چھڑائی جاسکتی ہے۔ اس کے نشے کی لت کا علاج ہوسکتا ہے۔ انہوں نے تو میری ہر کوشش کو ناکام کردیا...." وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

ڈاکٹر صائمہ نے اسے تسلی دی۔ اگر وہ نہ ہوتی تو یہ کام میرے لیے بہت مشکل اور صبر آزما ہوجاتا۔ آپ اکیلے ہوں' کوئی حسین اور دکھی عورت آنسو بہانے لگے تو آپ کیا کریں گے..... ذرا ہمدردی کی اور اس نے آپ کے سینے پر سر رکھ کے رونا شروع کردیا تو جذبات کے دھارے کا رخ یقیناً بدل جائے گا۔

بالآخر خیال آگاہی نے اپنے آنسو پونچھے "کیا آپ کے خیال میں یہ لوگ وہی تھے؟"

"یس مسز خیال آگاہی۔" میں نے کہا "انہوں نے جمال کو بھی عادی بنایا اور اپنا محتاج رکھا۔ وہ آپ کی کوشش کو کامیاب کیسے ہونے دیتے۔ خانس گیلری کا چوکیدار' اس کی بیوی اور آپ کا شوہر۔ سب ان چوروں کے آلہ کار بنے۔ مجھے یقین ہے لیکن ابھی ثبوت نہیں ہے میرے پاس' وہ بھی مل جائے گا۔"

"جو بھی بات ہو۔ مجھے ضرور بتانا مسٹر زماں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے باہر نکلتے ہی میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور اپنے موبائل فون سے ظالم خان کے موبائل فون کا نمبر ملایا "ظالم خان۔ میں مرنے والا ہوں۔ جلدی پہنچو۔ میرے فلیٹ پر" میں نے ایسے کہا جیسے واقعی مجھ پر نزع کا عالم طاری ہو اور پھر فون بند کردیا۔

"اب حالت خراب ہو رہی ہے" صائمہ نے کہا "اسی لیے میں نے منع کیا تھا۔"

"اس کی ذمّے دار تم ہو" میں نے کہا "اگر تم نے گھر بسانے کی شرط عائد نہ کی ہوتی تو میں اس چکر میں کیوں پڑتا۔ کیوں عین عالم شباب میں مقتول ہوتا۔ ابھی میں نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا..... روتے ہیں چھم چھم نین!"

ابھی ہم لڑ رہے تھے کہ ظالم خان آپہنچا۔ وہ مجھے زندہ سلامت اور خیروعافیت کے ساتھ دیکھ کے بہت مایوس اور خفا ہوا "اچھا ہوا میں اپنے ساتھ مردے ڈھونے والی ایمبولینس نہیں لایا۔"

میں نے کہا "دوست! تم نہیں دیکھ سکتے مگر میری نظریں ہر سمت موجود قاتلوں کو دیکھ رہی ہیں۔ وہ منتظر ہیں کہ میں باہر نکلوں درو وہ مجھے فوت کردیں۔ مسٹر میکاسا، عاقل خان اور پتا نہیں کون کون۔ کسی کو پچاس لاکھ چاہئیں کسی کو اسٹنگر میزائل۔ تم مجھے بچانے کی کوشش کرسکتے ہو۔"

ایک سوٹ کیس ظالم خان نے اٹھایا اور دوسرا میں نے۔ میرے یقین کے مطابق اس وقت آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ظالم خان کی کار کی ڈکی اتنی بڑی تھی کہ دونوں سوٹ کیس اس میں رکھے جاسکتے تھے۔ گاڑی میں نے ڈرائیو کی۔ وہ ریوالور ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ دو کلومیٹر کے بعد میں نے گاڑی روک لی۔ ظالم خان اتر کے واپس گیا۔ تقریباً دو سو گز پیچھے صائمہ نے اپنی کار بھی روک لی تھی۔ وہ صائمہ کی کار میں بیٹھ گیا تو میں نے ۱۹۹۸ء ماڈل کی تقریباً نئی کار کو آگے بڑھا دیا۔

صائمہ کی چھوٹی سی سفید کار آہستہ آہستہ پیچھے رہ گئی۔ میں نے وہ ریوالور اٹھالیا جو ظالم خان بھول گیا تھا۔ ابھی شام ہوئی تھی اور مجھے کم سے کم چار پانچ گھنٹے روپوش رہ کے گزارنے تھے۔

○☆○

سہراب گوٹھ سے سپرہائی وے پر جاتے ہوئے میں نے ہر گاڑی کو موقع فراہم کیا تھا کہ مجھے اوورٹیک کرکے آگے نکل جائے مگر اس کے باوجود میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرے تعاقب میں کوئی نہیں تھا اور مجھ سے پہلے وہاں کوئی موجود نہیں ہوگا۔

گاڑی کو میں نے اٹھارویں کلومیٹر پر مخالف سمت میں گھنی جھاڑیوں کے پیچھے کھڑا کردیا جہاں کسی فرضی یا مرحوم ہاؤسنگ سوسائٹی کا بورڈ لگا ہوا تھا پھر میں نے تقریباً دو کلومیٹر کا فاصلہ ایک موٹر سائیکل سوار سے لفٹ لے کر طے کیا اور رات گیارہ بجے گلشن معمار کے دیوہیکل سائن بورڈ پر اتر گیا۔ مزید آدھا گھنٹا میں نے وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں کے مالکان کا خوش اخلاقی سے شکریہ ادا کرتے گزارا جو خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے لفٹ دینے پر آمادہ تھے۔

ساڑھے گیارہ بجے روٹ نمبر 4.L کی کھڑکھڑاتی جھومتی، تھرکتی بس گزری۔ یہ آخری بس ہی ہوسکتی تھی۔ اس میں مسافر ایسے بھرے ہوئے تھے جیسے شہد کے چھتے میں مکھیاں، یا انار میں دانے لیکن میری امیدوں پر اس وقت اوس پڑگئی جب ایک بھی انار دانہ وہاں نہیں ٹپکا اور کسی نے میرے لیے ہاتھ باہر نکال کے کوئی رقعہ بھی نہیں پھینکا۔

اب مجھے لوٹ کے جانا تھا۔ میں نے دو کلومیٹر کا فاصلہ اندھیری سڑک پر پیدل طے کیا۔ میری گاڑی اسی ویرانے میں موجود تھی۔ میں نے احتیاط سے کام لیتے ہوئے دونوں سوٹ کیس کچھ فاصلے پر پھینک دیے تھے اور اوپر خشک جھاڑیاں اور کانٹے ڈال دیے تھے۔

انہیں دوبارہ ڈکی میں رکھ کے میں نے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی اور گاڑی میں بیٹھتے ہی ریوالور سیٹ پر رکھ دیا۔ گاڑی کو موڑ کر میں دوبارہ سپر ہائی وے پر آیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی ٹائر فلیٹ نہیں ہوا تھا۔

اٹھارویں کلومیٹر کے قریب بائیں طرف بھی تاریکی اور ویرانی تھی۔ تاحد نظر پھیلے ہوئے جھاڑیوں کے جنگل میں ایک پتلی سی کچی سڑک دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ مجھے اسی سڑک پر جانے کی ہدایت تھی۔ اگر وہاں کوئی پچاس لاکھ کی خاطر مجھے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کرلیتا تو رات بھر میں بڑے اطمینان سے مجھے ہی نہیں اس کار کو بھی دفن کرسکتا تھا۔

ٹوٹی پھوٹی سڑک پر گڑھے تھے اور جھٹکوں سے جتنا میرا بُرا حال تھا، اس سے زیادہ گاڑی کو ذہنی اذیت ہورہی ہوگی۔ یہ ایسا ہی ظلم تھا جیسے کوئی نئی نویلی دلہن کو سیر کے بہانے پیدل سبزی منڈی لے جائے اور وہاں اسے کدو کریلے کی شاپنگ کرائے یا ہنی مون کے لیے عوامی کی عوامی کلاس میں باتھ روم کے پاس کھڑا کرکے گرمی کے موسم میں سبّی لے جائے۔

میری جان الگ عذاب میں تھی اور میرے اعصاب پر ہر لحہ یہ خوف غالب تھا کہ جن بھوت نہ سہی، ابھی اچانک کسی نامعلوم سمت سے نمودار ہونے والے نقاب پوش میرا راستہ روک لیں گے یا صرف ایک گولی میرے سر میں سوراخ کرتی گزر جائے گی۔ مٹی دھول، تھکن اور کوفت سے میرا حال خراب تھا۔

رات سوا بارہ بجے میرے فون کی گھنٹی بجی۔ ایک لڑکی نے ہذیانی انداز میں ہنستے ہوئے کہا "شاباش ہیرو۔ اچھے جارہے ہو۔"

میں نے کہا "کسی کی جان گئی آپ کی ہنسی ٹھہری۔"

اس نے کہا "ہم نے دیکھ لیا۔ تم بھروسے کے قابل ثابت ہوئے۔"

"پھر اب کیا حکم ہے میرے لیے؟"

"ابھی اسی گاڑی میں اسلام آباد روانہ ہوجاؤ۔"

میں نے چیخ کے کہا "ابھی.....بائی روڈ۔ تمہیں معلوم ہے یہاں سے اسلام آباد کا فاصلہ کتنا ہے؟ آئی ایم سوری.....!"

"تم کسی ڈرائیور کو اپنے ساتھ رکھو مثلاً..... مثلاً ڈاکٹر صائمہ کو" وہ پھر اسی طرح ہنسی۔ یہ بڑی غیر فطری مصنوعی سی ہنسی تھی۔

"دیکھو۔ یہ معاملہ بلاوجہ لمبا کرنے سے کیا فائدہ....."

"یہ آخری آزمائش ہے..... مسٹر کولمبو!" وہ یوں ہنسی جیسے اس پر شراب کا نشہ غالب ہو۔ ہیروئن کے زیرِ اثر لوگ سکون سے مسکراتے ہیں۔

فون بند ہوگیا تو میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اپنی ساکھ اور اپنی جان بچانے کے لیے میں یہ سب کرنے پر مجبور تھا۔ صرف دس لاکھ کی بات ہوتی تو میں کہتا کہ لعنت مجھ پر بھی اور تم پر بھی۔ معاہدہ ختم سمجھو مگر اب یکطرفہ طور پر کوئی فیصلہ کرنا میرے اختیار کی بات

نہیں تھی۔
رات ایک بجے صائمہ کو جگا کے فون پر بات کرنے کے لیے بلانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ صاف انکار کر دیتی۔ میں نے اس کی روم میٹ نیلم کو بلوایا۔
"دیکھو۔ تم بہرحال میری متبادل محبوبہ ہو' صائمہ کی جانشین۔ تم کو مستقل مزاجی سے میرا ساتھ دینا چاہیے۔" میں نے کہا "کیا پتا کبھی تقدیر تم پر مہربان ہو جائے۔"
وہ ہنسی "صائمہ کو لے جانا ہے کہیں؟"
"ہاں مگر پہلے تم بھی سمجھ لو کہ وہ میرے ساتھ اسلام آباد جائے گی۔"
جب نیلم نے میری بات سمجھ لی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میں نے بیس منٹ گاڑی سے کچھ فاصلے پر ریوالور ہاتھ میں رکھ کے نشانہ لینے کی مشق کرتے گزارے مگر میرے ہاتھ ایسے کانپ رہے تھے جیسے مجھے کرنٹ لگ رہا ہو۔ یہ بڑی حوصلہ شکن اور مایوسی کی بات تھی۔ ضرورت پڑنے پر میں گولی کیسے چلاؤں گا اور یہی کیفیت رہی تو گولی کا نشانہ بن جائے گی صائمہ یا گولی نکل جائے گی خلا کی طرف۔ کوئی مصنوعی سیارہ دھڑام سے نیچے آگرے گا۔ ڈش پر نشریات دیکھنے والے خالی اسکرین کو گھورتے رہ جائیں گے کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔
صائمہ نمودار ہوئی تو میں تاریکی سے بھوت کی طرح نکل آیا۔ اس نے واجبی سی چیخ ماری اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میری بات سن کے اس نے ایک اور چیخ ماری "کیا.... اسلام آباد!" اور دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
میں نے مصطفیٰ قریشی اسٹائل میں کہا "جاتے کدھر ہو سوہنیو! یہ ریوالور نقلی نہیں ہے۔ تمہارے بزدل عاشق زار نے اغوا کر لیا ہے تمہیں۔"
صبح تک میں نے ڈرائیونگ کی اور صائمہ نے میری مجبوری کو سمجھ لیا تو اپنی مجبوری سے بھی سمجھوتا کر لیا۔ صبح سورج نکلا تو ہم کراچی سے تین سو ساٹھ کلومیٹر دور تھے۔ ناشتے کے بعد میں پچھلی سیٹ پر سو گیا اور چار گھنٹے بعد جاگا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد رات تک پھر میں نے ڈرائیونگ سنبھالی اور صبح ہوئی تو ہم لاہور میں تھے۔ ٹینشن سے بچنے کے لیے میں نے رفتار بھی کم رکھی تھی اور وقفے وقفے سے چائے کے بہانے تازہ دم ہونے کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا۔
ہم لاہور سے نکل آئے تھے جب ہمیں اسی لڑکی نے پھر فون پر مزید ہدایات دیں۔ "تمہاری کارکردگی اور ایمانداری کی شہرت بلاوجہ نہیں ہے۔ دس لاکھ تم نے ایسے ہی نہیں کمائے۔"
میں نے کہا "تم چاہتی ہو کہ انکم ٹیکس والے میرے پیچھے لگ جائیں۔"
وہ اسی بچکانہ دیوانگی والے انداز میں ہنسی "انکم ٹیکس یہاں صرف بے وقوف دیتے ہیں اور تم خاصے سیانے ہو۔ راولپنڈی میں تمہارا قیام سلور گرل ہوٹل میں ہوگا۔ یہ افسوس کی بات ہے یا خوشی کی.... کہ کمرا ایک ہی ملا ہے؟ مسٹر اور مسز ڈاکٹر زماں کے نام سے۔"
صائمہ نے اس اطلاع پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا "میں کسی اور ہوٹل میں جا سکتی ہوں۔ کشمیر والا ان قریب ہے۔"
"کیا تمہیں بھروسا نہیں ہے اس شرافت کی دیوار پر..... جو میرے اور تمہارے درمیان حائل رہی ہے۔ ویسے بھی..... میں بزدل ہوں۔"
"نہیں" اس نے مختصراً کہا "تم پاگل ہو۔"
لیکن اسلام آباد پہنچ کے وہی ہوا جو منظورِ خدا تھا۔ گہرے بادل اچانک برسنے لگے اور صائمہ کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہ شدید بارش میں کشمیر والا ان یا مال پر کسی قریبی ہوٹل میں الگ کمرے کی تلاش میں جا سکے۔ میں نے ایک بار پھر اسے حلف اٹھا کے یقین دلایا کہ شادی سے پہلے میں اس پر بُری نظر بھی نہیں ڈالوں گا۔ یہ تو خیر میں نہیں کہہ سکتا' اسے ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ اس کی کوشش کروں گا مگر ہاں شرافت کی دیوار کو گرنے نہیں دوں گا' یہ وعدہ ہے۔
وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ میں نے فرش پر بستر بچھایا اور آہیں بھرتے ہوئے کہا "نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔"
"سچ ہے پھر روتے کیوں ہو؟" صائمہ بولی۔
"آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالب!" میں نے کہا "لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں۔"
وہ ہنسی "غالب' اقبال اور فیض' سب یاد آ گئے۔"
دروازے پر دستک ہوئی تو میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ میں نے دو من وزنی دولت اپنی گاڑی کی ڈکی میں ہی چھوڑ دی تھی۔ میرے خیال میں وہ اس کے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔ گاڑی کا لاک الیکٹرانک تھا۔ اسے کوئی کھولنے کی کوشش کرتا تو الارم کی آواز مجھے اپنے کمرے میں سنائی دیتی۔
"یہ کون ہو سکتا ہے؟" میں نے گویا خود کو مخاطب کیا "ویٹر اتنے بدتمیز نہیں ہوتے' شرافت سے دروازے پر انگلی مارتے ہیں۔"
دوسری بار زیادہ قوت کے ساتھ دروازہ بجانے والے نے میرا نام بھی لیا "بزدل.... دروازہ کھولو.... پلیز..!"
صائمہ کا رنگ اڑ گیا تھا اور وہ سیدھی بیٹھی دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ میں بہادر بن کے دروازے تک گیا اور صائمہ کی خاطر میں نے مسکرانے کی کوشش بھی کی "یہ تو کوئی جاننے والا ہی ہے" میں نے کہا۔
دروازہ کھلتے ہی عاقل خان میرے قدموں میں گر گیا۔ ایک لمحے کے لیے میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہو گئی۔ میں یہ

بھی نہ پوچھ سکا کہ عاقل خان تم یہاں؟ میں نے وہ خون دیکھ لیا تھا جو میرے قدموں کے پاس پھیلنے لگا تھا۔ ایک دم میری ہر خوابیدہ صلاحیت جاگ اٹھی۔

میں نے اسے اندر کھینچا اور دروازہ بند کردیا۔ خون اس کے سینے کے کسی زخم سے بہہ رہا تھا لیکن وہ ابھی زندہ تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کے کہا "یہ کیا ہوا عاقل خان۔ کیا تمہیں گولی لگی ہے؟"

اس نے بڑی مشکل سے اقرار میں سر ہلایا "وہ..... وہیں موجود تھے..... دونوں..... میں..... تمہارے پیچھے تھا..... اور وہ..... وہ میرے پیچھے۔"

میں نے جھک کر پوچھا "کون دونوں.....؟ نام جانتے ہو تم ان کے؟"

"وہ..... راجہ..... اور اس کی داشتہ۔..... اس نے خنجر گھونپ دیا مجھے اور وہ..... ہنستی رہی..... فاحشہ....." اس کی آواز کمزور پڑنے لگی۔

"کون راجہ..... پورا نام بتاؤ....." میں نے اسے ہلایا مگر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہ مر گیا تھا۔ لالچ نے اس کی زندگی کو کچھ اور مختصر کردیا تھا۔ تمام عمر رشوت لے کر دولت مند بن جانے والا ایک سب انسپکٹر عاقل خان۔ میرے ساتھ صرف سو روپے کی بازی ہارتا تھا مگر یہ بہت بڑا جوا تھا جس میں وہ اپنی زندگی ہار گیا تھا۔ وہ میرے دس لاکھ میں حصہ بٹانا چاہتا تھا۔ شاید وہ پورے پچاس لاکھ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا تھا۔

صائمہ دہشت سے بے ہوش ہونے کے قریب تھی اور پلک جھپکائے بغیر عاقل خان کے بے حس و حرکت جسم کو دیکھ رہی تھی۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں مسز خیال آگاہی اور پھر ایس پی اسلام آباد سے رابطہ قائم کروں اور انہیں بتاؤں کہ قصور میرا نہیں، محبت کا ہے۔ وہ محبت جو مجھے صائمہ سے ہے۔ جو مجھے اپنے وطن سے ہے اور اپنے اصولوں سے ہے اور اپنے فرض سے ہے۔ اے محبت ترے انجام پہ رونا آیا۔ یعنی وہی..... روتے ہیں چھم چھم نین۔

ایس پی اسلام آباد نے ساری تفصیل بڑے تحمل سے سنی۔ اس کے ساتھ آنا مسز خیال آگاہی نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں نے اسے سب بتادیا۔ جمال آگاہی کے بعد چوکیدار اور اس کی بیوی پھر شیر شاہ اور اب عاقل خان۔ پانچ قتل ہوجانے کے باوجود میں زندہ تھا۔ "میرے خیال میں اب مجھے عقل آجانی چاہیے اور اس سارے معاملے سے الگ ہوجانا چاہیے۔ بھاڑ میں جائیں دس لاکھ۔ اسٹنگر میزائل۔ مقدس نقش اور مسٹر میکا سا۔ آپ ایسے پچاس لاکھ اپنے پاس رکھیں اور مجھے جانے دیں" میں نے کہا۔

چونکہ میں صائمہ کے جذبات کی ترجمانی کررہا تھا اس لیے وہ کانپتی رہی اور تائید میں سرہلاتی رہی مگر ایس پی اسلام آباد متاثر نہیں ہوا۔

"غلطی آپ نے کی کہ پولیس کو کچھ نہیں بتایا۔ ہم آپ کی حفاظت بھی کرسکتے تھے مگر آپ اخبار والے خود کو افلاطون سمجھتے ہیں اور ہم سے تو خدا واسطے کا بیر ہے آپ کو۔ پولیس میں سب رشوت کھانے والے نااہل لوگ نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ ذہانت اور محنت سے اور ایمانداری سے فرض بھی نبھاتے ہیں....." اس کے لہجے میں تلخی تھی مگر دبی دبی۔

"شاید یہ آپ لوگوں کو دخل در معقولات کی اجازت نہ دینے کا ہی نتیجہ ہے کہ میں ابھی تک زمین کے اوپر نظر آرہا ہوں۔ زیرِ زمین نہیں....." میں نے کہا۔

ہوٹل کے منیجر نے پھر کہا "سر..... دیکھیے، آپ جب تک چاہیں قیام کریں..... آپ میرے مہمان..... جب بھی ادھر آنا ہو....."

میں نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا "بہت جلد ہم اپنا ہنی مون گزارنے آئیں گے۔ مجھے یہ ہوٹل پسند ہے۔ تیس پینتیس سال پہلے جب یہ ایک ریسٹورنٹ تھا، کسی کوٹھی میں تو والد صاحب مرحوم آتے تھے یہاں۔"

اس نے مجھ سے پُرجوش مصافحہ کیا "آپ تو خاندانی قدرداں ہیں ہمارے لیکن گستاخی معاف..... اتنی اچھی بیوی کے ہوتے آپ دوسری شادی کریں گے۔"

میں نے کھنکھار کے کہا "وہ..... دراصل..... یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو تو اچھا ہے..... یہ بات بھی کسی کو معلوم نہیں ہوگی..... ایک دوسرے کی عزت اور نیک نامی کا خیال رکھنا چاہیے ہمیں۔"

ایس پی اسلام آباد نے بڑی دانش مندی سے کام لیتے ہوئے ایک گھنٹے سے کم وقت میں بڑی خاموشی کے ساتھ لاش اٹھوادی۔ صائمہ اب کسی صورت اس کمرے میں رکنے پر آمادہ نہ تھی۔ خوش قسمتی سے ایک کمرا کچھ دیر پہلے خالی ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا "تم اس کمرے میں جاکے سوجاؤ۔"

"میں..... اکیلی....." اس نے کہا "نہیں۔ تم بھی ساتھ چلو۔"

میں نے کہا "شرافت کی دیوار سمیت؟ اچھا بابا چلو۔"

اپنے کام سے فارغ ہوکے ایس پی پھر میرے پاس آیا اور سگریٹ جلاکے بیٹھ گیا "مسٹر زماں۔ صورتِ حال بہت سنگین ہوگئی ہے۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ پچاس لاکھ کی رقم کے مقابلے میں آپ کی یا میری جان کی قیمت کچھ نہیں۔ قاتل کا اگلا ہدف آپ ہوسکتے ہیں لیکن اس مرحلے پر آپ کے لیے پیچھے ہٹنا بھی ممکن نہیں۔ آپ کی پوزیشن وہی ہے کہ آگے کنواں پیچھے خندق۔ ایک طرف خطرناک مجرم ہیں جو صرف پیسے کے لیے آپ کی جان لینے کے درپے ہیں۔ دوسری طرف یہ سیاسی معاملہ ہے۔ اسٹنگر میزائل حکومتِ پاکستان کو واپس ملنے چاہئیں۔ حکومت پر امریکی دباؤ ہے اور یہاں مسٹر میکا سا کی سفارتی سرگرمی کو دہشت گردی سے تعبیر کیا جارہا ہے کیونکہ ہم سنگاپور کو تسلیم کرتے ہیں، کمبوڈیا

کو نہیں۔"

میں نے اس کی بات پر غور کیا "آپ کیا چاہتے ہیں آخر؟"

"اس معاملے کو آپ اکیلے ہینڈل مت کریں۔ پولیس کی مدد براہِ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر ناگزیر ہے آپ کے لیے۔ مجرم آپ کو قتل کر کے اور پچاس لاکھ روپے لے کر بھاگ گئے تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اسمبلی میں ہنگامہ ہوگا اور پریس سے خدا بچائے۔ ہمارا تعاون، ہماری حماقت کہلائے گی۔ اس کیس میں مجرموں کی گرفتاری بہت ضروری ہے زماں صاحب ورنہ آپ کو معلوم ہے کل کیا ہوگا؟ فرض کریں آپ کامیاب ہوگئے۔ پچاس لاکھ دے کے آپ نے وہ نقشہ حاصل کرلیا اور اسٹنگر میزائل بھی مل گئے، تب بھی یہ سوال ضرور اٹھایا جائے گا کہ آپ نے مجرموں کو تحفظ فراہم کرنے پر اصرار کیوں کیا تھا۔ آپ کیوں چاہتے تھے کہ پولیس مداخلت نہ کرے پھر آپ کو بھی مجرموں کا ساتھی فرض کرلیا جائے گا۔ یہ کہا جائے گا کہ دس لاکھ کے علاوہ آپ نے انہیں بچانے کا معاوضہ مجرموں سے بھی لیا ہوگا۔ آپ کے خلاف تفتیش ہوگی، آپ کو حب الوطنی اور بہادری کی سند نہیں ملے گی۔ الٹا آپ غدار اور وطن دشمن عناصر کے آلۂ کار سمجھے جائیں گے۔ آپ کی نیک نامی آپ کے کام نہیں آئے گی۔ جب معاملہ سیاسی ہو تو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ کراچی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی دن آپ کی لاش بوری میں بند سڑک پر ملے اور الزام کسی پر نہ آئے۔ سب ایک دوسرے پر انگلی اٹھاتے رہیں اور بس...."

میری مزاحمت کم ہوتے ہوتے ختم ہونے لگی تھی۔ "او کے۔ پولیس مجھے بتائے بغیر اور میرے مشورے کے بغیر کچھ نہیں کرے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ پولیس آپ کے تابع ہوگی۔"

"اور پولیس فورس کی نگرانی کرے گا ظالم خان.... میرا مطلب ہے انسپکٹر رحم دل خان۔ جتنا میں اسے سمجھتا ہوں، اتنا ہی وہ مجھے سمجھتا ہے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا "رحم دل خان صبح کی پہلی فلائٹ سے پہنچ جائے گا۔ ابھی آپ لوگ سکون سے سو جائیں۔ باہر کافی نفری کھڑی کردی ہے میں نے سادہ لباس میں۔ اگر سکون آور دوائی کی ضرورت ہو تو منگا لیں۔"

میں نے کہا "میری وائف۔ شی از اے ڈاکٹر، یو نو؟"

رات کے آخری پہر میں صائمہ سوگئی تو میں نے بھی سوچا کہ اب وعدہ خلافی میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے کہا ضرور تھا کہ تم سو جاؤ۔ میں بیٹھا ہوں یہاں تمہارے پاس مگر اب میرا سر بار بار غنودگی میں جھک رہا تھا۔ صائمہ پر ایک نظر ڈال کے میں اپنے فرش پر بچھے ہوئے بستر پر لیٹا اور سو گیا۔

میں خواب میں دیکھ رہا تھا کہ آئی جی پولیس اور توپ صاحب میرے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں جس پر لکھا ہے۔ بزدل کے لیے جو سب سے بہادر تھا۔ میرے مرقد کے سرہانے کتبے کی جگہ اسٹنگر میزائل لگایا گیا ہے۔ صرف اس کا REPLICA جو اصلی میزائل لگتا ہے۔

لات پڑتے ہی میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ آنکھیں مل کے میں نے پہلے گھڑی کی طرف دیکھا جس میں گیارہ بجے تھے پھر صائمہ کی طرف جو اسی طرح سو رہی تھی اور آخر میں ظالم خان کی طرف جو میرے سر پر ملک الموت کی طرح سوار تھا۔

"معاف کرنا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم دونوں ایک ہی کمرے میں ہو۔ کم سے کم اندر سے دروازہ لاک کرلیتے" ظالم خان معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"اس کمرے میں شرافت کی دیوار بھی ہے جو تم کو نظر نہیں آئے گی.... تم بڑی جلدی پہنچ گئے" میں نے ایک جماہی لے کر کہا۔

"میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں" وہ صوفے پر بیٹھ گیا "مجھے بہت افسوس ہوا یہ جان کر کہ اتنے لوگ مرگئے مگر تم ابھی زندہ ہو۔ خیر، اب میں آگیا ہوں۔"

صائمہ نے باتوں سے ڈسٹرب ہو کے آنکھیں کھولیں اور پھر اٹھ کے بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ بال پریشان تھے اور چہرہ ظالم خان کو دیکھ کے حیا سے گلابی ہونے لگا تھا۔ اس نے دوپٹہ سنبھال کے اسے سلام کیا۔

"جیتی رہو۔ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو" ظالم خان بولا "میرا مطلب ہے شادی کے بعد۔"

ہوٹل کی لابی میں اور باہر سادہ کپڑوں میں ہر شخص مجھے پولیس کا آدمی نظر آنے لگا تھا۔ ہم ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال میں گئے۔ صائمہ ابھی غسل کر رہی تھی پھر اسے کپڑے بدلنے تھے اور سولہ سنگار کر کے نیچے آنا تھا۔ میں نے چائے کے ایک کپ پر اکتفا کرتے ہوئے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا۔

"عاقل خان نے صرف راجا کہا تھا۔ اس سے کچھ پتا نہیں چلتا کیونکہ پوٹھوہار کے علاقے میں تو سب راجا ہیں پھر مجھ سے فون پر بات کرنے والی کوئی رانی تھی۔ میں خود حیران ہوں کہ عاقل خان کو یہاں ہوٹل میں کسی نے خنجر گھونپ دیا اور صاف نکل گیا۔ کسی نے بھی اسے نہیں دیکھا۔ خنجر اس کے دل میں اتر گیا تھا اس لیے وہ چند منٹ میں مرگیا۔"

ظالم خان نے سر ہلایا "میرا خیال ہے کہ اسے تمہارے کمرے کے عین دروازے پر خنجر گھونپا گیا۔ پہلی دستک انہی کی ہوگی۔ انہوں نے عاقل خان کو اندر دھکیلا اور بھاگ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ باہر کہیں خون نہیں تھا۔ تم نے باہر جھانک کے کوریڈور میں نہیں دیکھا ہوگا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ سب سے پہلے مجھے اس کو اندر کھینچ کے دروازہ بند کرنے کا خیال آیا تھا۔ عاقل خان نے مجھ سے غلط نہیں

کہا تھا۔ وہ انہیں جانتا تھا۔ معلوم نہیں کیسے؟ مگر اسے یہاں دیکھ کے وہ گھبرا گئے اور انہوں نے فوری طور پر اس کا منہ بند کردیا' ہمیشہ کے لیے۔"

ظالم خان سوچتا رہا "میرا ذہن کچھ الجھ گیا ہے۔"

میں نے کہا "میں سمجھاتا ہوں تمہیں۔ چوری کی منصوبہ بندی کرنے والا جمال آغا ہی تھا۔ اسے پیسے کی ضرورت تھی۔ وہ ہزاروں میں خرچ کرنے کا عادی تھا مگر اس کے پاس ہزاروں کمانے کے مواقع نہیں تھے۔ وہ روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو اسی لیے خانس آرٹ گیلری میں ملازم رکھوایا تھا کہ وہ خود یہ کام نہیں کرسکتا تھا۔ جمال نے چوکیدار کو اور اس کی بیوی کو بھی ہیروئن کا عادی بنایا اور انہیں ہیروئن فراہم کرتا رہا۔ اس نے چوکیدار کو نمائش میں رکھی ہوئی ایک چیز غائب کرنے کے لیے کہا تاکہ وہ واپس آرٹس گیلری کو فروخت کرکے پچاس لاکھ حاصل کرسکے۔ اس کی انشورنس ایک کروڑ میں ہوئی تھی۔ جب چوکیدار نے وہ چیز اسے فراہم کردی تو اس نے چوکیدار کا کام تمام کردیا۔ چوکیدار کی بیوی تفتیش کے دوران میں تشدد سے ہلاک ہوگئی۔"

"اس نے خودکشی کرلی تھی۔"

"چلو یوں ہی سہی۔ اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا تو وہ خاک بتاتی۔ جمال کو اس چوری پر اکسانے والے دو پیشہ ور چور تھے مگر یہ کام ان کے بس کا نہیں تھا۔ وہ خود کسی اور کے لیے یہ کام کررہے تھے۔ جمال نے انہیں وہ چیز دے دی تو چوروں نے اسے ہیروئن کی دگنی یا چار گنا مقدار کا انجکشن دیا اور جب وہ مرگیا تو اس کی لاش کو گاڑی میں ڈال کے جی ٹی روڈ پر لے گئے۔ وہاں انہوں نے گاڑی کا ایکسیڈنٹ کرادیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جمال کی ملاقات ان چوروں سے شیر شاہ کی معرفت ہوئی ہو۔ وہ چوری کی گاڑیاں خریدتا اور بیچتا تھا۔ وہی میرے قابلِ اعتبار ہونے کا ضامن بھی بنا تھا۔ پچاس لاکھ میں وہ بھی حصے دار بنا ہوگا۔ چوروں نے ایک حصے دار بھی کم کیا اور بلیک میل ہونے کے خطرے سے بھی نجات حاصل کرلی۔ اب راجا اور رانی بلا شرکت غیرے پچاس لاکھ کی چیز کے مالک ہیں۔"

ظالم خان نے سر ہلایا "یہ سب سمجھ میں آتا ہے۔ عاقل خان کا قتل پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا' وہ کیسے جانتا تھا چوروں کو؟"

میں نے کہا "ولی را ولی می شناسد۔ پولیس والے ہی چوروں کو جانتے ہیں۔ کیا پتا اس نے شیر شاہ سے کچھ سنا ہو یا اس کے ساتھ انہیں دیکھا ہو۔ جب اسے پتا چلا کہ پچاس لاکھ کی ایک چوری کے سلسلے میں مجھے ثالث کے طور پر دس لاکھ پیش کیے گئے ہیں تو اس کی رال ٹپکی ہو وہ بھی میرے پیچھے لگ گیا۔ وہ میرے نکل جانے کے بعد شیر شاہ کی ورکشاپ میں گیا ہوگا۔ اتنا اس نے ضرور سمجھ لیا ہوگا کہ شیر شاہ کو میں نے قتل نہیں کیا۔ شیر شاہ بڑا چور تھا بلکہ چوروں کا ایجنٹ تھا۔ عاقل خان نے وہاں دو چوروں کو کسی بڑے کام کی بات کرتے سنا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ شیر شاہ نے میرے قابلِ اعتبار ہونے کے بارے میں رستم بیگ سے پوچھا تھا۔ رستم نے شرافت علی سے۔ دو اور دو کو جمع کرنے سے جواب چار ہی آتا تھا۔ اس نے اندازہ کرلیا کہ پچاس لاکھ کی چوری کس نے کی ہوگی جس کا معاملہ میرے ذریعے طے ہورہا تھا۔ اس نے مجھے بتانے کی کوشش کی تھی.... مگر میں نے سودا نہیں کیا اور وہ مارا گیا۔"

ظالم خان نے گھڑی دیکھی "کیا ناشتا ہوگا لنچ کے وقت؟ میری سمجھ میں یہ لڑکیاں نہیں آتیں۔ کیا ایمرجنسی میں آپریشن کے لیے جانے سے پہلے بھی یہ میک اپ میں اتنا ہی وقت ضائع کرتی ہوں گی؟"

"میک اپ کرنا ہر لڑکی کا پیدائشی اور بنیادی حق ہے۔ تم نے اسے کچھ کہا تو تم خود ضائع ہوجاؤ گے" میں نے میز پر مکا مارا۔

ویٹر دوڑا ہوا آیا "یس سر۔ کیا ناشتا لے آؤں؟"

"لے آؤ۔" میں نے متانت سے کہا "تین افراد کے لیے۔"

میں نے پہلے محسوس کیا اور پھر دیکھا کہ صائمہ آرہی ہے۔ ہال میں ہر شخص کے سحر زدہ اور ہکا بکا نظر آنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی تھی۔

"چوروں کا تم پر اعتبار قائم ہوچکا ہے" ظالم خان بولا "یہ کتنی قابلِ فخر بات ہے ایک صحافی کے لیے۔ شریف اعتبار نہیں کرتے تو نہ کریں۔"

"شریف کون...." میں نے کہا "تم جیسے....؟"

"یہ معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اس میں کوئی تمہاری گڈول سے فائدہ اٹھا کے ملک کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ ان کی گرفتاری سے تمہارے کاروباری مفادات متاثر نہیں ہوں گے۔ اب وہ پکڑے جائیں گے۔"

صائمہ نے شکایتی لہجے میں کہا "اور کوئی موضوع نہیں ہے۔"

میں نے کہا "فیض کی نظم ہے موضوعِ سخن.... اپنا موضوعِ سخن اس کے سوا اور نہیں مگر یہاں ایک بدذوق باہر کا آدمی کباب میں ہڈی بنا ہوا ہے۔"

"ایک بجے مجھے ایس پی صاحب نے بلایا ہے۔" وہ بولا "کیا میں گاڑی لے جاؤں؟"

"تم ٹیکسی میں زیادہ آرام سے جاسکتے ہو" میں نے کہا۔

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ہیلو کے جواب میں مجھے وہی پاگل پن کی ہنسی سنائی دی۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ لڑکی ہر وقت نشے میں رہتی ہو۔ اس طرح کی ہنسی اس کی فضول سی عادت تھی۔

"اس وقت ایک بجا ہے" وہ بولی "آج رات دس بجے تمہیں اپنی خبر مل جائے گی۔ رقم ساتھ لے کر آنا۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ مجھے کہاں پہنچنا ہوگا؟"

"قذافی اسٹیڈیم کے گیٹ نمبر سات پر" وہ بلا وجہ ہنسی۔

"قذافی اسٹیڈیم۔ وہ تو لاہور میں ہے۔ اب میں لاہور جاؤں؟" میں نے برہمی سے کہا "تم نے کہا تھا کہ یہ آخری آزمائش ہے۔ تمہیں بھروسا نہیں ہے مجھ پر تو جان چھوڑو میری۔"

وہ کھلکھلا کے ہنسی "بالکل نئے ماڈل کی گاڑی ہے تمہارے دوست انسپکٹر رحم دل خان کی۔ موٹروے سے تم چار گھنٹے میں پہنچ سکتے ہو' نو پرابلم۔"

فون بند ہو جانے کے بعد میں نے ظالم خان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ "میرا خیال ہے کہ ایس پی صاحب سے تم معذرت کرلو۔ میری طرف سے۔ ہم نکل جاتے ہیں اسی وقت.... ابھی میں جاتا ہوں ٹیکسی میں۔ ایوب نیشنل پارک کے گیٹ سے مجھے پک کرلینا۔ تین بجے...."

میں نے کہا "بس ہم تمہارے ساتھ ہی نکلتے ہیں۔"

اس نے اٹھتے ہوئے کہا "وہ.... دراصل مجھے ملنا ہے کسی سے..... یہاں روز آنا کب ہوتا ہے۔ ایک متبادل محبوبہ ہے اپنی بھی۔"

صائمہ نے جل کے کہا "متبادل بیوی کہنا چاہیے تمہیں تو۔"

○☆○

قذافی اسٹیڈیم رات کے ماحول' ویرانی اور خاموشی میں بہت مختلف تاثر دیتا تھا۔ ابھی یکم نومبر سے میں نے یہاں چار قومی آزادی کپ کرکٹ ٹورنامنٹ دیکھا تھا۔ سہ پہر سے رات نو دس بجے تک شوقین لوگوں کے تالیاں' کرسیاں' ڈھول تاشے اور بگل بجانے... ازدحام پر دیوہیکل ٹاور روشنی پھیلاتے رہتے تھے۔ ایسے چھ ٹاور تھے جن میں سیکڑوں چندھیا دینے والی لائٹس تھیں اور یہ ایک خودکار کمپیوٹرائزڈ نظام سے روشن ہوتی تھیں یعنی جیسے جیسے تاریکی بڑھتی تھی' ان کی روشنی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا اور گراؤنڈ کے جس حصے میں جتنی روشنی درکار ہوتی تھی' اتنی ہی پہنچتی تھی۔ گراؤنڈ میں رات کے وقت بھی دن کا سماں رہتا تھا اور دیکھنے والوں کو سفید بال زیادہ واضح نظر آتی تھی۔

وہ کرکٹ ٹورنامنٹ ایک بارونق میلہ تھا جس میں کرکٹ سے زیادہ لوگ اپنی موجودگی کا بھرپور لطف اٹھاتے تھے اور شرکت کے احساس کی اجتماعی خوشی بانٹتے تھے۔ اس وقت وہاں سناٹا تھا اور اندھیرا تھا مگر میں اپنے تصور میں ساری آوازیں سن رہا تھا۔ اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ رہا تھا۔ رنگ برنگے لباس پہنے کرکٹ ٹیموں کو۔ تماشائیوں کو جو پیپسی کولا کی پلاسٹک کی بوتلوں سے کرسیاں اور تالیاں ایک ساتھ بجاتے بجاتے تال بدل دیتے تھے۔ جھنڈے لہراتے نوجوانوں کو' آنچل لہراتی کرکٹ سے زیادہ کرکٹرز میں دلچسپی لینے والی نازنینوں کو۔ کوئی بولڈ ہوتا تھا یا چھکا مارتا تھا تو ایک دم شور محشر اٹھتا تھا اور عجیب و غریب حلیے بنا کے آنے والے جوان ناچنے لگتے تھے۔ یہ کرکٹ کا میدان ہی تھا جہاں بوڑھے اور سنجیدہ عمر کے لوگ بھی ہر عجیب' مضحکہ خیز اور نئی حرکت کرنے یا حلق سے جانوروں کی آوازیں نکالنے' چیخیں مارنے اور گلا پھاڑنے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ یہ سب کہیں اور نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ گھر میں نہ سڑک پر نہ کسی تقریب میں اور نہ میلے میں۔ چنانچہ وہ ٹی وی کے سامنے آرام سے بیٹھ کر کرکٹ دیکھنے کے بجائے یہاں آجاتے تھے اور واپسی میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتے تھے۔

گیٹ نمبر سات سے کچھ فاصلے پر روشنی کا ٹاور کسی دیوہیکل درخت کی شاخ کی طرح بڑے وقار اور خاموشی کے ساتھ آگے جھکا ہوا اندھیرے میں بھی نیچے ہونے والی سب کارروائی دیکھ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر الحمرا کمپلیکس میں بہت رونق تھی۔ سڑک پر سے گاڑیاں اپنی خیرہ کن روشنی کے ساتھ دوڑتی جارہی تھیں مگر میرے آس پاس ویرانی تھی۔

میں نے گاڑی کو کچھ فاصلے پر اسی جگہ کھڑا کیا جہاں مجھے تاکید کی گئی تھی پھر میں نے پچاس لاکھ کے نوٹوں سے بھرے ہوئے دو من وزن کے سوٹ کیس ڈکی میں سے نکالے۔ خوف سے صائمہ کا دل خراب تھا۔

"مجھے تو یہاں کہیں بھی کوئی حفاظت کے لیے موجود نظر نہیں آتا' کیا انتظام کیا ہے تمہارے ظالم خان نے" صائمہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

میں نے انگلی آسمان کی طرف اٹھائی "میری محبوبہ نمبر ون۔ بھروسا تقدیر کے سوا کسی پر نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں نہیں جس کا کوئی اس کا خدا ہے۔"

"ریوالور تو اپنے ساتھ لے جاؤ" وہ بولی۔

"لے جانے میں کوئی حرج نہیں مگر اسے چلائے گا کون؟" میں نے کہا "میرے دونوں ہاتھوں میں دولت ہے مگر میں دولت میں نہیں کھیل رہا ہوں۔ دولت مجھ سے کھیل رہی ہے۔ ریوالور تم اپنے پاس رکھو۔ شاید تمہارے کام آجائے۔ ظالم خان نے تمہیں گولی چلانا سکھادیا تھا۔ یہ مت بھولنا کہ گولی سامنے سے نکلتی ہے اور اس کے لیے نشانہ لے کر ٹریگر بھی دبانا پڑتا ہے۔"

"کیا میں تمہارے ساتھ چلوں؟"

"نادان حسینہ۔ یہ حکم ہے کہ میں اکیلا جاؤں۔ گیا تو دنیا سے بھی اکیلا ہی جاؤں گا۔ میری متبادل محبوبہ نمبر دو کو بھی اللہ صبر جمیل عطا کرے اور میرے جیسا کوئی حسین و جمیل متبادل پرستار۔ آمین" میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا "تم کو یہیں بیٹھ کے انتظار کرنا ہے۔ جب کوئی آئے تو چیخ مت مارنا۔ بے ہوش ہونا ہو تو خاموشی سے ہونا۔ پلٹ کے تو ہرگز مت دیکھنا۔ وہ مطلوبہ چیز پیچھے والی سیٹ پر رکھ کے چلے جائیں گے۔ تم پانچ منٹ تک یہ بھی نہیں دیکھو گی کہ انہوں نے ٹائم بم یا اسٹنگر میزائل تو نہیں رکھ دیا۔ اس کے بعد تم گاڑی چلا کے اس طرف لاؤ گی جدھر ڈریسنگ روم اور پویلین ہے۔ میں ادھر سے مسکراتا ہوا خالی ہاتھ نمودار نہ ہوا تو میری روح..... ایک سفید کبوتر بن کے اڑتی ہوئی آئے گی۔"

"جاؤ... دفع ہو جاؤ" صائمہ چلاّ کے بولی "ایسی باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ کچھ مت کہو۔"

"آہ.... کیا گانا یاد آیا ہے" میں نے سوٹ کیس پھر اٹھالیا "کچھ نہ کہو، کچھ بھی نہ کہو، بالکل وہی سین ہے تقریباً۔ ۱۹۴۲ء اے لو اسٹوری والا۔ ڈرامائی تاثر دینے کے لیے تم گاڑی کے ڈیک پر یہ کیسٹ لگادو ذرا..."

ایسی باتیں کرنے کے باوجود اندر سے میری حالت بھی ویسی ہی تھی جیسی پھانسی کے تختے کی طرف جانے والے مجرم کی ہوسکتی ہے۔ یہ بے حس اور بے ضمیر دہشت گرد قسم کے مجرم تھے جن کے نزدیک شرافت، ایفائے عہد اور انسانی زندگی کی کوئی قیمت نہیں تھی۔ وہ اب تک پانچ قتل کرچکے تھے۔ انہیں مجھ پر لاکھ بھروسا اور اعتبار سہی مگر صرف اس بنیاد پر کہ میں نے کبھی کسی مجرم کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا تھا، میں بخشے جانے کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں گڑگڑا کے یہ دلیل دیتا کہ ذرا سوچو، بعد میں کسی چور ڈاکو یا اغوا کرنے والے کو ثالث بنانے کی ضرورت پڑی تو میرے جیسا ایمان دار آدمی کہاں ملے گا۔ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ وہ کہتے کہ شٹ اپ۔ ہمیں یہ سب سوچنے کی کیا ضرورت ہے اور تمہیں فکر کیوں ہے کہ تمہارے بعد دنیا کا نظام کیسے چلے گا۔ یوں ہی آباد رہے گی دنیا، تم نہ ہوگے کوئی تم سا ہوگا اور پھر ٹھائیں سے طمنچہ داغ دیتے۔ کوے نے ہنس کی چال چلنے کی کوشش کی تھی۔ ایک صحافی نے جاسوس بننے کی اور بزدل نے بہادر بننے کی کوشش کی تو مارا گیا۔ روتے ہیں چھم چھم نین۔

سوٹ کیس اٹھائے میں نے پورے گراؤنڈ کا فاصلہ بڑی مشکل سے طے کیا۔ مجھے یقین تھا کہ پویلین میں ڈریسنگ روم پہنچنے تک میرے دونوں ہاتھوں کی لمبائی میں دو من وزن اٹھانے سے دو انچ کا اضافہ ہوگیا ہے۔ مجھے اپنی انگلیاں اپنے گھٹنوں کو چھوتی محسوس ہورہی تھیں۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی دس بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ میں نے جیب سے رومال نکال کے پسینہ خشک کیا۔ یہ ظالم خان کا حسن انتظام تھا کہ مجھے اس وقت ڈریسنگ روم میں آنے سے کسی نے نہیں روکا تھا۔ میں نے تصور کیا کہ یہاں کتنے عظیم کرکٹر اپنے زیرو پر آؤٹ ہونے پر آٹھ آٹھ آنسو بہاچکے ہوں گے اور کتنے سنچری بنانے پر ہنس ہنس کے مبارک باد وصول کرچکے ہوں گے اور کتنے جان بوجھ کر رن بنائے بغیر آؤٹ ہونے پر ضمیر کی ملامت نہ سنتے ہوئے یہ سوچتے رہے ہوں گے کہ کسی سٹے باز سے ملنے والے لاکھوں سے وہ کون سی گاڑی لیں گے یا کہاں کوٹھی بنائیں گے۔

مجھے انسپکٹر ظالم خان کی ذہانت پر بھروسا تھا۔ اسے میری درخواست اور خواہش پر مکمل اختیارات حاصل ہوگئے تھے اور کسی کو اس کے کام میں دخل اندازی کی اجازت نہیں تھی۔ معاملہ بیک وقت میری ایک زندگی، پانچ اسٹنگر میزائل اور پچاس لاکھ ضائع ہوجانے کا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے میری حفاظت اور پانچ افراد کے قاتلوں کی گرفتاری کے لیے ایسا جال بچھایا ہوگا جو کسی کو نظر نہیں آسکتا مگر خود کو انتہائی چالاک سمجھنے والے ایسے پکڑے جائیں گے جیسے چوہے دان میں سانپ کی گردن پھنس جائے۔

میں نے تھوڑی بہت روشنی میں نمبر دیکھا اور ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اب میری نظر کے سامنے پچ کا بہترین ویو تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کے خود کو میانداد یا عمران خان محسوس کرنے کی ناکام کوشش کی۔ خوف سے میرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے اور عین وقت پر مجھے ٹائلٹ جانے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اس سیٹ کے بازو کے نیچے ایک خفیہ سوئچ لگادیا گیا تھا جس کا تار کسی کو بھی نظر نہیں آسکتا تھا۔ میں نے انگلیوں سے ٹٹول کر سوئچ کی موجودگی کو محسوس کیا تو میرے پیٹ کی گڑگڑاہٹ کچھ کم ہوئی۔ میرا حلق اب بھی خشک تھا اور میری نظر کچھ فاصلے پر رکھے ہوئے پچاس لاکھ کے نوٹوں سے بھرے سوٹ کیسوں پر تھی۔

مجھے صرف اتنا کرنا تھا کہ جیسے ہی کوئی سوٹ کیس اٹھانے آئے، اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر وہ سوئچ دبادوں۔ باہر کہیں ایک سرخ بلب جل جاتا جہاں انسپکٹر رحم دل خان بڑی بے رحمی کے جذبات سے بھرا ہوا اپنی پولیس فورس کے ساتھ مجرموں کو ہر طرف سے محصور کرنے اور دبوچنے کے لیے تیار بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی کمان میں پولیس کی پوری مسلح بٹالین تھی اور وہ سب سادہ کپڑوں میں آس پاس چھپے ہوئے تھے۔

سرخ بلب جلتے ہی لائٹس کا وہ ٹاور روشن ہوجاتا جو پویلین کے عین اوپر تھا۔ اس سے مرکزی دروازے کے سامنے والی سڑک کا کچھ حصہ بھی روشن ہوجاتا جدھر سے مجرم گاڑی میں فرار ہونے کی کوشش کرسکتے تھے۔ ٹاور کے عین نیچے ایک بہت بڑے فولادی کنٹینر میں لائٹس کا پورا کنٹرول تھا جسے ایک کمپیوٹر چلاتا تھا مگر یہاں ایک ڈیزل جنریٹر بھی نصب تھا جسے واپڈا کی بجلی جاتے ہی چلایا جاسکتا تھا۔ یہ اسٹینڈ بائی جنریٹر تھے جو میچ کے دوران میں لائٹس کو روشن رکھ سکتے تھے۔

میں پھر گھڑی دیکھنا چاہتا تھا جب مجھے ایسا لگا جیسے پویلین کی چھت میرے سر پر گر گئی ہے۔ کسی نے میرے سر پر کچھ مارا تھا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ اپنی وفات حسرت آیات کا یقین آنے کے باوجود مجھے کلمہ پڑھنے کا موقع تک نہ ملا مگر بقول شاعر۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

مجھے پھر ہوش آیا تو مجھے سب سے پہلے مونچھیں نظر آئیں پھر آہستہ آہستہ ظالم خان کا پورا چہرہ فوکس میں آگیا جو مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے صائمہ کا چہرہ ایک تضاد پیش کرتا تھا۔ جیسے کیکر کے پیچھے چنبیلی کی بیل۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ کے مجھے مایوسی ہوئی۔ اس کے باوجود میں نے روایتی فلمی سوال کرنا ضروری

سمجھا۔ ”میں کہاں ہوں؟“

ظالم خان مسکرایا ”تم دوسری دنیا میں تھے۔ اب واپس آجاؤ اپنی دنیا میں۔“

میں نے سر کو چھو کے دیکھا۔ میرا سر سالم تھا، دو ٹکڑے نہیں ہوا تھا لیکن اندر درد کے عفریت دھمال ڈال رہے تھے اور اچانک میرا سر ایک من کا ہوگیا تھا۔ اسے ہلانے کی کوشش کرنا لاحاصل ہوتا۔

ایک بہت بیمار نظر آنے والے ڈاکٹر نے مجھے کوئی انجکشن لگایا۔ اس کے پیچھے کھڑی ہوئی خاصی قبول صورت نرس نے مسکرا کے صائمہ سے کچھ کہا اور صائمہ نے آگے آکے میرا ہاتھ تھام لیا ”تم خیریت سے ہو؟“

”یہ تم مایوسی کا اظہار کررہی ہو یا حیرت کا؟“ میں نے کہا اور پھر ظالم خان سے مخاطب ہوگیا ”کیا وہ آئے تھے؟“

اس نے کچھ شرمندگی سے سرہلایا ”آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہوگیا۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہارا سر مفت میں نشانہ بنا۔ وہ رقم لے گئے مگر دے کر کچھ نہیں گئے۔ کھایا پیا کچھ نہیں، گلاس توڑا بارہ آنے کا“ صائمہ نے طنز سے کہا۔

رحم دل خان نے دکھی نظر آنے کی کوشش کی ”ڈاکٹر صائمہ، مجھ پر لگانے والوں نے ہر الزام عائد کیا ہے۔ سوائے نااہلی کے۔ میرا انتظام خراب تھا، قسمت خراب تھی۔“

”کس کی؟“ میں نے کہا اور اسپتال کے اس کمرے پر نظر ڈالی جس میں مجھے باقاعدہ داخل رکھا گیا تھا ”کیا مجھے کئی دن بعد ہوش آیا ہے؟ آج دن اور تاریخ کیا ہیں؟“

”تم اپنی کلائی کی گھڑی سے تصدیق کرسکتے ہو کہ ابھی بارہ نہیں بجے۔ تاریخ نہیں بدلی۔ تم ایک گھنٹا بے ہوشی کا ڈراما کرتے رہے۔ تمہاری حالت بالکل خطرے میں نہیں تھی۔“ ظالم خان بولا ”ایک معمولی گومڑ کی کوئی اہمیت نہیں۔“

میں نے صائمہ کی طرف فریادی نظروں سے دیکھا ”تم اس ظالم تھانے دار کا ظالمانہ رویہ دیکھ رہی ہو۔ حالانکہ مجھ پر نزع کا عالم ہے۔“

”تمہیں ابھی ابھی نیند کا انجکشن دیا گیا ہے۔ صبح سو کے اٹھوگے تو باقی باتیں کریں گے۔ میں بیٹھی ہوں یہاں تمہارے پاس“ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”ظالم کے بچے، اتنا تو بتادو مجھے کہ وہ کون تھے؟“

صائمہ نے کہا ”بڑی ذہانت، مستعدی اور جاں فشانی سے پولیس نے اتنا ضرور معلوم کرلیا ہے کہ وہ مجرم تھے۔“

ظالم خان نے جواب دینے سے کھسک جانا بہتر سمجھا۔ جواب اس کے پاس تھا بھی نہیں۔

میں نے غنودگی میں کہا ”صائمہ۔ اگر وہ میرے سر پر... اسٹنگر میزائل ماردیتے... تو تم کیا کرتیں؟“

”وہی جو تم چاہتے تھے.... میں تمہارا متبادل تلاش کرتی۔ جو پانچ لاکھ تم نے میرے پاس رکھوائے تھے، وہ میرے بہت کام آتے۔“

ظاہر ہے ایسی دل شکن اور درد انگیز گفتگو سننے سے سوجانا بہتر تھا۔ میں صبح جاگا تو میری حالت بہت بہتر تھی۔ صائمہ صوفے پر نیم دراز اخبار دیکھ رہی تھی اور چائے پی رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کے وہ مسکرائی ”کیا حال ہے سر کا سر!“

میں نے کہا ”کیا تم واقعی رات بھر جاگتی رہیں؟“

”مجھے عادت ہے۔ رات کی شفٹ اکثر مل جاتی ہے۔ چائے پیوگے؟“

”اسپتال کی چائے“ میں نے بُرا سا منہ بنایا ”کیسی ہے؟“

”میں نے باہر سے منگوائی تھی“ اس نے اپنی پیالی میں مجھے باقی چائے ڈال دی ”یہاں نخرے نہیں چلیں گے۔“

چائے میں نے دودھ کے بغیر پی تو مجھے اچھی لگی ”ذرا مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ رات کیا ہوا تھا؟“

”بتانے کو اب کیا ہے۔ میں تو اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ ظالم خان نے بتایا کہ کام خراب ہوگیا۔ مجرم وہاں پولیس کی گاڑی میں اور وردی میں پہنچے۔ انہوں نے سارا سسٹم ناکارہ کردیا۔ لائٹ کے ٹاور کا سرکٹ بریکر خراب کردیا۔ جب ضرورت پڑی تو ٹاور پر ایک لائٹ نہیں جلی۔ اس کے بعد اسٹینڈ بائی جنریٹر کو چلانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے اسٹارٹر میں ایلفی ڈال دی گئی تھی۔ ظالم خان کا اندازہ ہے کہ مجرم انہی کے درمیان تھے اور وردی میں سب کے ساتھ آئے تھے۔ رازداری کے لیے ہر تھانے سے کچھ لوگ طلب کیے گئے تھے۔ ظالم خان تو کسی کو بھی نہیں پہچانتا تھا۔ ان سب کو ایک ہی جگہ بریف کیا گیا اور ظاہر ہے مجرموں نے سارا پلان وہیں سمجھ لیا پھر وہ سادہ کپڑوں میں یہاں لائے گئے اور اِدھر اُدھر پوسٹ کیے گئے۔ لائٹس کے ٹاور کنٹرول میں کسی کی ڈیوٹی نہیں تھی۔ وہاں ایک الیکٹرک انجینئر آجاتا ضرورت کے وقت۔ اس نے ظالم خان کو سمجھادیا کہ لائٹس کو ایک بچہ بھی آن کرسکتا ہے۔ سارا نظام خودکار ہے۔ بس ایک سرکٹ بریکر آن کرتے ہی ٹاور روشن ہوجائے گا۔ خرابی کی صورت میں جنریٹر کا اسٹارٹر سوئچ ایک چابی سے آن ہوتا ہے۔ اگر لائٹ جل جائے تو جنریٹر خود بخود چل پڑتا ہے۔ انجینئر صاحب اپنا کام کرکے چلے گئے۔ خود ظالم خان نے اسے کہا کہ بس اب ہم کرلیں گے۔ آپ جائیں، دس بجے تک کسی نے سرکٹ بریکر میں کوئی خرابی پیدا کردی اور جنریٹر کے سوئچ میں ایلفی ٹپکادی۔ سوا دس بجے تک سب منتظر رہے کہ تم سوئچ دباؤ اور سرخ بلب جلے تو کارروائی شروع ہو۔“

”دس بجے سے پہلے ہی انہوں نے مجھے اتنا غفیل کردیا تھا۔

میں نے کسی کو بھی نہیں دیکھا۔ کوئی پیچھے سے آیا ہوگا" میں نے کہا۔
"دس بج کر بیس منٹ پر ظالم خان خود ڈریسنگ روم میں گیا تو تم نیچے گرے پڑے تھے اور سوٹ کیس غائب تھے۔ وہ اسٹیڈیم کے اندر ہی چلتے گئے اور وہیں پہنچ گئے۔ گیٹ نمبر سات پر..."
"تم نے دیکھا انہیں؟ تم بھی وہیں موجود تھیں۔"
"میرا خیال ہے کہ میں نے دیکھا تھا۔ ایک مرد اور ایک عورت نظر آئے تھے مجھے۔ دونوں سوٹ کیس مرد نے اٹھار کھے تھے۔ میں تو سیدھا دیکھتی رہی پھر ایک پولیس کی گاڑی آئی اور وہ اس میں بیٹھ گئے۔"
"کیسی گاڑی؟"
"جیسی وہ مٹرگشت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ موبائل کہتے ہیں اسے۔ اس پر نمبر بھی لکھا ہوا تھا مگر میں پڑھ نہیں سکی۔ میں نے سمجھا کہ پولیس مجرموں کی گرفتاری کے لیے بروقت پہنچ گئی۔ وہ اسی گاڑی میں نکل گئے۔ اس وقت تک خاصی افراتفری پھیل گئی تھی۔ پولیس والے جو چھپے ہوئے تھے' سامنے آگئے تھے اور ظالم خان کے حکم پر اندر کی طرف بھاگ رہے تھے اور گاڑیوں میں بیٹھ رہے تھے۔ ان کا پلان بڑا مکمل تھا۔ یہاں کسی تھانے کے عملے نے ان کی مدد کی یا پھر انہوں نے کوئی گاڑی چھینی۔ اس میں موجود پولیس والوں کو ماردیا اور خود ان میں شامل ہوگئے جن کو اس مشن کے لیے بریف کیا گیا تھا۔ یہ صرف نااہلی ہے اور سیکیورٹی کی ناکامی۔ ان سب کے نام اور شناختی کارڈ وغیرہ چیک کرنے لازمی تھے جن کو یہاں لایا گیا تھا۔ بس فرض کرلیا کہ فلاں تھانے سے آئے ہیں تو تھانے والوں کے بھیجے ہوئے بندے ہوں گے۔ لائٹس کے ٹاور کی ذمّے داری اس انجینئر کو نہیں سونپی گئی جو سب سمجھتا تھا اور کچھ کرسکتا تھا۔ یہ بھی فرض کرلیا گیا کہ سب ٹھیک ہے۔ انجینئر نے کہا کہ یہ بڑا جدید نظام ہے۔ ابھی چار قومی ٹورنامنٹ ہوا تھا نومبر میں۔ صرف ایک بار ذرا سی دیر کا بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ اس کے سوا اندر تم پر نگاہ کسی نے نہیں رکھی۔ خفیہ کیمرے بھی لگائے جاسکتے تھے ہر طرف۔ ظالم خان کا مؤقف ہے کہ اس کے لیے ٹائم نہیں تھا۔ بس اتنا ہی وقت ملا کہ ہم ایک سوئچ لگادیں جس سے الارم آن ہوجائے۔ ہمیں پتا چل جائے کہ اندر کوئی آیا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ تم کسی کو دیکھوگے تو فوراً بٹن دبادو گے اور سرخ بلب خاموشی سے روشن ہوجائے گا۔"
میں نے کہا "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اب کیا ہوگا؟"
"کچھ نہیں۔ بس ہم چلتے ہیں واپس۔ یہ کوئی ہوٹل نہیں ہے اسپتال ہے۔ ابھی ڈاکٹر آجائے تو تمہاری ڈسچارج سلپ لیتی ہوں۔"
میں نے کہا "مجھے یہاں کون لایا تھا؟"
"میں.... میں نے ہی تمہیں سب سے پہلے دیکھا تھا اور گاڑی میں ڈال کے یہاں لے آئی تھی۔ اگر میں ڈاکٹر نہ ہوتی تو یہاں تمہیں کوئی نہ دیکھتا۔ سب یہی کہتے کہ میڈیکولیگل کیس ہے۔ میو اسپتال جاؤ۔"
میں نے کہا "تم نے میری جان بچائی۔ اس کے بدلے میں تمہیں کیا پیش کروں۔ اپنا دل نذر کروں' اپنی وفا پیش کروں؟"
"دیکھو اب ختم کرو یہ کھیل۔ پانچ لاکھ کا وہ منحوس چیک میرے بیگ میں پڑا ہوا ہے۔ اسے واپس کروا اپنی خیال آگاہی کو۔"
میں نے کہا "یہ سب اتنا آسان ہوتا تو کیا تھا۔ ہمیں کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔ جنہوں نے مجھے پچاس لاکھ کسی رسید کے بغیر دیے تھے' کیا وہ مجھے چھوڑیں گے۔ کیا انہیں شک نہیں ہوگا کہ میں نے رحم دل خان کے ساتھ مل کے رقم خورد بُرد کرلی۔ ہم دوست بھی ہیں اور اسے میں نے بطور خاص بلوایا تھا۔"
"اس کو معطل کردیا گیا ہے۔" صائمہ نے کہا "اس کا فون آیا تھا کہ مروادیا مجھے اس موئی نے۔ اب میرے خلاف تحقیقات ہوں گی۔ ابھی خاص لوگ جانتے ہیں' جب اخباروں تک بات پہنچے گی تو عام لوگوں کو بھی پتا چل جائے گا اور اس کے بعد..."
موبائل فون کی گھنٹی سُن کے صائمہ خاموش ہوگئی۔ میرا یہ نمبر گنے چنے لوگوں کو معلوم تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت یاد کرنے والا ظالم خان نہ ہوا تو پھر خیال آگاہی کا پیغام ہوگا مگر میرے "ہیلو" کے جواب میں مسٹر میکاسا کی آواز سنائی دی "سر۔ کیا حال ہے آپ کی طبیعت کا اب۔ چوٹ زیادہ تو نہیں آئی تھی کل رات؟ ویسے تو میں نے اسپتال والوں سے بھی رات کو پوچھا تھا۔"
میں نے کہا "تھینک یو۔ میں زندہ ہوں۔"
"آپ زندہ رہیں گے سر۔" اس نے بڑے عاجزانہ انداز میں دعا کی "آپ ہمارے مشکل کشا ہیں اور یہ بات ہم جانتے ہیں۔ اسی لیے آپ کی حفاظت کے خیال سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے۔ یقین کریں..."
"یقین مجھے پہلے آچکا ہے کہ تم بھوت ہو۔ لاتوں کے بھوت۔"
"نہیں سر۔ ہم خیر خواہ نہ ہوتے آپ کے تو مطمئن ہو کے بیٹھ جاتے کہ اب پولیس بھی ہے تو ہم کیوں فکر کریں لیکن ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں سر کہ رائے عامہ کچھ اچھی نہیں ہے پولیس کی کارکردگی کے بارے میں... اگر ہم مستعد نہ ہوتے تو مجرم نکل جاتے۔"
"نکل جاتے کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ بھاگ جاتے لیکن ہم نے انہیں موقع نہیں دیا۔ دونوں کو پکڑلیا وہیں اور اپنے ساتھ لے آئے۔ ایک جوان آدمی ہے اور دوسری ایک عورت ہے جو اس کی محبوبہ اور شریکِ کار وغیرہ ہے۔ مجھے تو بے وقوف سی لڑکی لگتی ہے۔ پتا نہیں اس چکر میں کیسے پڑگئی۔ خواہ مخواہ ہنستی ہے سر۔ اس بات پر بھی جو ہنسنے کی بات ہی نہیں ہوتی۔"

میں بھونچکا بیٹھا رہا "مسٹر میکا سا۔ آپ یہ بتا رہے ہیں مجھے کہ آپ نے مجرم پکڑ لیے ہیں اور وہ آپ کی تحویل میں ہیں؟"

"یس سر۔ یہی بتانے کے لیے زحمت دی ہے میں نے آپ کو۔"

"اور پچاس لاکھ روپے کی رقم؟"

اس نے کہا "وہ محفوظ ہے سر۔ اسی طرح..... سوٹ کیس کھولے بھی نہیں گئے۔"

میں نے بے یقینی سے کہا "اور..... وہ چیز...؟"

اس نے بڑے ملال سے کہا "یہی تو افسوس ہے سر..... ہماری چیز ہمیں نہیں ملی۔ ہم پچاس لاکھ لے کر کیا کریں گے۔ ہمارا مسئلہ پیسہ نہیں ہے اور نہ یہ چور ہمارے کام کے ہیں۔ ہم تو انہیں پولیس کے حوالے کردیتے مگر میں نے سوچا کہ سر شاید آپ خود تشریف لانا پسند کریں۔"

میں چھلانگ مار کے بستر سے کھڑا ہوگیا۔ "آف کورس میں تشریف لانا پسند کروں گا مگر میں کہاں آؤں مسٹر میکا سا..... اور کیسے؟"

"مجھے اندازہ تھا سر کہ آپ رقم وصول کرنے کے لیے اور چوروں سے ... نمٹنے کے لیے خود آنا چاہیں گے چنانچہ میں نے گاڑی بھیج دی تھی سر۔ اس وقت بھی اسپتال کے احاطے میں موجود ہے۔ آپ ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ وہی ڈرائیور ہے 'لیڈو' نام ہے اس کا۔"

"مسٹر میکا سا۔ یہ کوئی چال تو نہیں ہے۔"

"آپ کیسی افسوسناک رائے رکھتے ہیں میرے بارے میں سر۔ میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ آپ سے میری ساری اُمیدیں وابستہ ہیں۔ میرے ملک کے غریب اور مظلوم عوام کے لیے آپ ہی نجات دہندہ ثابت ہوں گے۔"

"یہ سب فضول باتیں چھوڑو۔ مجھے اپنا پتا سمجھاؤ۔"

"لیڈو پر چھوڑ دیں سب کچھ سر۔ اوہ..... میں سمجھ گیا۔ آپ ان سب کو بتا کے آنا چاہتے ہیں جو آپ کی حفاظت پر مامور ہیں۔ آپ بھروسا نہیں کرتے مجھ پر۔ خیر' کیا آپ نے "جی او آر" بنگلے دیکھے ہیں۔ ایک غریب اور مقروض ملک کے سرکاری حکام کے عالی شان محلات کا محلّہ۔ بس اسی کے آخری حصے کے ایک بنگلے میں آنا ہے آپ کو۔ آپ چاہیں تو اپنی گاڑیاں لیڈو کے پیچھے آجائیں....." اس نے مجھے پتا سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مسٹر میکا سا۔ ڈاکٹر صائمہ بھی میرے ساتھ ہوں گی اور ہم ناشتا آپ کے پاس کریں گے۔ جی نہیں' میں نے لنچ نہیں کہا۔ بریک فاسٹ کہا ہے" میں نے کہا۔

فون بند کرتے ہی میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا۔ مسٹر میکا سا کی سیاہ لمبی کار دوسری بہت سی گاڑیوں کے ساتھ پارکنگ ایریا میں موجود تھی اور لیڈو ڈرائیور کی سیٹ پر مستعد بیٹھا چیونگم چبا رہا تھا۔ میں نے صائمہ کو تیاری اور ڈسچارج سلپ بنوانے کے لیے دس منٹ دیے۔ "اس کے بعد میں تمہیں اٹھا کے اس۔ رل سے باہر کود جاؤں گا اور فرار ہوجاؤں گا۔" میں نے کہا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ میرے نکلنے تک اس نے اسپتال سے رخصتی کی تیاری مکمل کرلی۔ لباس بدلنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے اور صائمہ نے کل رات والے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ہمارے ساتھ اسباب جو بھی تھا' کار کی ڈکی میں تھا۔ میرے اور صائمہ کے کپڑے ایک ہی سوٹ کیس میں تھے مگر میں نے اسے بال بھی نہیں بنانے دیے "تم ایسے ہی بہت قیامت ڈھا رہی ہو۔ ہمارا تو منہ ہی ایسا ہے کہ بار بار دھونا پڑتا ہے پھر بھی دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ تمہارا حسنِ ماہتابی کسی آرائش کا محتاج نہیں.... اور تمہاری یہ زلفِ پریشاں.... ساون کی گھٹا۔ تمہاری یہ خوابیدہ آنکھیں جن میں.... ساری مستی شراب کی سی ہے۔" میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ہم کوریڈور سے اور لاؤنج سے گزرے۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے اور احتجاج کرنے کی کوشش ترک کردی کیونکہ اسپتال کا عملہ اس کی بے بسی کا تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

لیڈو نے ہمارے لیے دروازہ کھولا اور جب ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے تو بڑے مؤدبانہ انداز میں بند کردیا۔ صائمہ کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔ "یہ کیا جنگلی پن ہے۔ کسی کا خیال نہیں..... لوگ کیسے دیکھ رہے تھے۔"

میں نے کہا "لوگ؟ کون لوگ۔ میں تو صرف تمہیں دیکھ رہا تھا...."

"اُف۔ یہ کس مشکل میں پڑ گئی میں" اس نے ایک گہری سانس لی "کب جان چھوٹے گی اس چکر سے۔ آیندہ جو تمہارے پاگل پن میں ساتھ دے وہ.... کافر۔ تین دن ہوگئے۔ پتا نہیں کیا سمجھتے ہوں گے سب۔ ڈاکٹر صاحبہ بھاگ گئیں۔ پتا نہیں تمہیں توپ صاحب کیسے برداشت کرتے ہیں۔ کان پکڑ کے نکال کیوں نہیں دیتے۔"

میں نے کہا "ان کا ہاتھ نہیں پہنچتا میرے کان تک۔"

وہ ہنس پڑی "بہت ڈھیٹ چیز ہو تم.... کیا واقعی وہ پکڑے گئے' رقم سمیت۔"

"دیکھو۔ کیا پتا بزدل پکڑا جائے بزدلی سمیت۔"

گاڑی نے ہارن دیا اور ایک کوٹھی کا گیٹ جیسے خود بخود کھل گیا۔ پورچ میں مسٹر میکا سا ہمارے استقبال کے لیے بہ نفسِ نفیس بہترین سیاہ سوٹ میں جگمگاتی سفید مسکراہٹ چہرے پر سجائے موجود تھے۔ انہوں نے مجھ سے مصافحہ کیا اور سر جھکا کے تقریباً رکوع میں جا کے صائمہ سے کہا "خوش آمدید حسین خاتون۔ یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ آپ بھی تشریف لائیں۔"

ہر عورت کی طرح اس خوشامدانہ اندازِ پذیرائی سے صائمہ بھی خوش ہوئی۔ مسٹر میکا سا نے ملازموں کی طرح دروازہ کھول کے

یں اندر تشریف لے جانے کی دعوت دی اور ہمیں سیدھا کھانے کے کمرے میں لے گئے۔ وہ ہر قدم پر بچھے جا رہے تھے اور ان کی نیاز مندی کا یہ انداز مجھے بھی اچھا لگ رہا تھا۔ ایسا وی آئی پی ٹریٹمنٹ کسے اچھا نہیں لگتا۔ وہ کوٹھی نہ جانے کس کی تھی لیکن اندر سے اس کی آرائش کے انداز نے مجھے احساسِ کمتری میں مبتلا کردیا۔

کرسٹل کے فانوس کے نیچے شیشے کے ٹاپ والی لمبی کھانے کی میز پر غالباً دنیا کا ہر ناشتا موجود تھا۔ پاکستانی اور انگلش سے لے کر چینی اور افریقی ناشتے تک۔ مسٹر میکاسا نے ایک ڈش کے بارے میں انکشاف کیا کہ یہ سنگانوے کے' جو انشاء اللہ بہت جلد جمہوریہ کمپوریا ہوگا' ایک خاص جانور کے مغز کو آنتوں میں بھر کے تیار کی گئی ہے۔ وہ لومڑی اور گیدڑ کی نسل کا جانور' جو بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے۔ ڈش میں جو گاڑھا سوپ ہے وہ اژدہے کا خون ہے اور اس میں جو سفید قتلے تیر رہے ہیں وہ گینڈے کی چربی ہے۔

ایسا لگتا تھا کہ صائمہ متلی سی محسوس کررہی ہے۔ میں نے سلائس اور انڈے پر اکتفا کرتے ہوئے موضوع بدل دیا "اس مہمان نوازی کے مظاہرے کا شکریہ۔ دراصل میری تو بھوک اڑ گئی ہے یہ سن کر کہ آپ نے چور بھی پکڑ لیے اور پچاس لاکھ بھی نہیں گئے۔"

اس نے مجھے پُرسکون رہتے ہوئے ناشتا کرنے اور اچھی جسمانی اور ذہنی صحت کے لیے ایسی غذا' اچھی طرح' اچھے ماحول میں کھانے کی اہمیت پر ایک لیکچر دیا "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ڈاکٹر صائمہ!"

صائمہ نے اس کی تائید کی "آپ کو غلط کون کہہ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اتنا تو بتا دیں کہ آخر آپ وہاں کیسے موجود تھے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "ہم کہاں موجود نہیں تھے سر۔ جب آپ کراچی میں آدھی رات کے وقت پچاس لاکھ کی رقم کے ساتھ جنگل میں پھر رہے تھے۔ وہاں کھڑے تھے' کیا جگہ ہے وہ۔ گلشنِ معمار اور آپ کی کار کافی فاصلے پر تھی۔ دونوں سوٹ کیس آپ نے باہر پھینک دیے تھے۔ اس کے بعد جب آپ تھانہ موچکا والی کچی سڑک پر خوار ہو رہے تھے۔ تب بھی ہم دیکھ رہے تھے۔"

"اور شاید آپ کو وہ دیکھ رہے تھے۔ جنہوں نے مجھے آدھی رات کے وقت حکم دیا کہ اسلام آباد روانہ ہو جاؤ بائی روڈ۔"

"ہو سکتا ہے سر۔ ہم تو اسلام آباد میں بھی آپ کے ساتھ رہے۔ سب سے زیادہ ہم نے آپ کی حفاظت کی۔ یہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی سر۔ بے شک ہم ہوٹل میں کمرا نہ حاصل کرسکے۔ ہم نے آپ کے دوست سب انسپکٹر کو بھی دیکھا تھا۔ وہ سائے کی طرح آپ کا پیچھا کررہا تھا اور ہم اس کی نیت کا اندازہ نہ کرپائے۔ ہم نے یہ سمجھا کہ وہ آپ کی مرضی سے ساتھ ہے۔ ہم رات ہی اس کے قاتلوں کو پکڑ لیتے مگر ہمیں ذرا دیر ہوگئی۔ وہ ہمارے سامنے سے نکل گئے۔ ایک جھلک ضرور دیکھ لی تھی ان کی میں نے سر۔ چنانچہ جب وہ اسٹیڈیم میں نظر آئے تو ہم نے سمجھ لیا سر کہ وہ کیا کریں گے۔ وہ پہلے سے اندر موجود تھے۔"

میں نے کہا "تم بھی پولیس بریفنگ میں شریک تھے؟"

"سب کرنا پڑتا ہے سر!" وہ بولا "زندگی بڑی مشکل ہوگئی ہے.... لیکن جب کمپوریا کے عوام کی مشکلات کا سوچتا ہوں...."

میں نے کہا "ہم کافی وہاں بھی پی سکتے ہیں۔ جہاں آپ کے مہمان موجود ہیں۔ کیا انہوں نے کچھ بتایا؟"

"آف کورس سر۔ ہم نے رات بھر تفتیش کی۔ ہمارا انداز کچھ ویسا ہی غیر شریفانہ ہوتا ہے.... جیسا آپ کی پولیس کا۔ شاید زیادہ سخت ہوتا ہے۔ انہوں نے ہر قتل کا اعتراف کرلیا لیکن وہ اور کچھ نہیں بتا سکتے سر۔ انہیں معلوم ہی نہیں۔ وہ صرف چور ہیں جو آلۂ کار بنے۔"

میں نے صائمہ کو مشورہ دیا کہ وہ اطمینان سے ناشتا جاری رکھے اور چاہے تو مسٹر میکاسا کا گھر دیکھے یا شادی کے بعد ایسے ہی کسی گھر میں رہنے کا خواب دیکھے۔ ورنہ ٹی وی پر کوئی زنانہ پروگرام...

مسٹر میکاسا نے بتایا کہ بنگلا ایک دوست کے افریقی ملک کے سفارتی عملے نے کرائے پر حاصل کر رکھا تھا۔ اس کے BASEMENT یعنی تہ خانے میں ایک بیڈ' اسٹور اور جمنازیم کے لیے جگہ نکالی گئی تھی اور یہ بڑی خفیہ جگہ تھی جس کا راستہ ہر شخص آسانی سے تلاش نہیں کرسکتا تھا۔ اسی بیڈ روم میں دونوں مجرم موجود تھے۔ ان کے ہاتھ کمر کے پیچھے بندھے ہوئے تھے' گلے میں رسی کا پھندا تھا جس کا دوسرا سرا صرف تین فٹ لمبا تھا اور اوپر دیوار میں لگائے گئے ہک سے بندھا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ کھڑے رہنے پر مجبور تھے۔ وہ نہ بیٹھ سکتے تھے اور نہ آگے پیچھے جا سکتے تھے۔ نیند سے محرومی نے تھکن کے عذاب کو شدید تر کردیا تھا۔

تفتیش میں دونوں نے ایک ہی بات بتائی تھی۔ جمال آگاہی نے شیر شاہ کی معرفت ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جمال آگاہی کو ہیروئن کے علاوہ بھی بہت سے مہنگے شوق تھے۔ اس نے کہا کہ خانس گیلری جاؤ' وہاں ایک چوکیدار تمہیں کچھ دے گا۔ وہ چیز اپنے ساتھ لے آؤ۔ اس کام کا معاوضہ تھا دس ہزار۔ انہیں کام بہت آسان لگا مگر جب جمال آگاہی نے انہیں بتایا کہ اس چیز کے بدلے پچاس لاکھ روپے مل جانا بہت معمولی سی بات ہے تو انہوں نے شیر شاہ سے کہا کہ یہ تو سخت ناانصافی ہے کہ پچاس لاکھ کی چیز ہم لائیں اور ہمیں صرف دس ہزار ملیں۔ شیر شاہ نے بھی ان سے اتفاق کیا اور اتفاق رائے سے انہوں نے جمال آگاہی کا پتا کاٹ دیا۔ بعد میں پتا چلا کہ جمال ہی چوکیدار کو بھی ہیروئن فراہم کرتا تھا تو چوکیدار کو راستے سے ہٹانا ضروری ہوگیا ورنہ وہ بھانڈا پھوڑ دیتا۔

اس کی بیوی تفتیش برداشت نہ کرسکی اور عادی تھی ہیروئن نہ ملنے سے پاگل ہوگئی اور اس نے خودکشی کرلی۔ سب انسپکٹر عاقل خان ذاتی طور پر شیر شاہ سے واقف تھا اور یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ ایک صحافی کی معرفت پچاس لاکھ کا کوئی سودا ہورہا ہے چنانچہ وہ پیچھے لگ گیا اور لالچ میں مارا گیا۔ شیر شاہ صرف اس لیے مارا گیا کہ اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا مگر وہ برابر کا حصے دار بنتا تھا۔ اب وہ دونوں ہی اس چیز کے مالک تھے اور پچاس لاکھ ان کو ضرور مل جاتے اگر مسٹر میکاسا بیچ میں ٹانگ نہ اڑاتے۔

ان کا آپس میں وہی رشتہ تھا جو ایک چور کا دوسرے چور سے یا ایک عورت کا کسی مرد سے ہوسکتا ہے۔ پچیس پچیس لاکھ لے کر انہیں اپنی اپنی زندگی گزارنے کے لیے اپنے اپنے راستے جانا تھا مگر اب انہیں صاف نظر آرہا تھا کہ وہ تختۂ دار تک ایک ساتھ جائیں گے اور جہنم کے عذاب میں بھی برابر کے شریک ہوں گے۔

وہ ہر قتل کا اعتراف کرچکے تھے مگر انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ چیز کہاں ہے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ خانس گیلری سے وہ چیز لے کر فلاں جگہ جائیں اور ایک گاڑی میں رکھ دیں جہاں ایک کار پہلے سے موجود ہوگی۔ کار وہاں تھی مگر ڈرائیور کے چہرے پر نقاب تھی اور ہاتھ میں ریوالور چنانچہ وہ کوئی بات کیے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے اور خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کی جان بچ گئی۔ گاڑی کی نمبر پلیٹ ہٹادی گئی تھی اور گاڑی عام قسم کی سفید رنگ والی سوزوکی مہران تھی۔

مسٹر میکاسا نے مجھے ایک سولڈ کرنے والی راڈ دکھائی جس سے عام طور پر ریڈیو، ٹی وی مکینک ٹانکا لگاتے ہیں۔ اس کا تار بجلی کے پلگ میں لگایا جائے تو چند منٹ میں یہ بجلی کی استری سے زیادہ گرم ہوجاتی ہے۔ اس جلتی ہوئی سلاخ سے صرف جسم کو داغنے سے مجرموں نے سب بتادیا۔ ابھی اس کا آخری استعمال باقی تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ چیز انہوں نے واقعی کسی کار میں رکھی تھی یا انہوں نے کہیں چھپادی ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مسٹر میکاسا تفتیش کا یہ انسانیت سوز طریقہ میرے سامنے استعمال کریں۔ میں واقعی بزدل ہوں مگر مسٹر میکاسا نے کہا کہ سر، سچ آپ اپنے کانوں سے سنیں۔

ان دونوں کی حالت پہلے ہی خراب تھی۔ میرا خیال تھا کہ لڑکی اس وحشیانہ عذاب سے جانبر نہ ہوسکے گی۔

”یہ سزائے موت کے مستحق ہیں سر۔ کیا حرج ہے اگر انہیں آج ایک سچ پر قربان کردیا جائے۔ یہ پانچ افراد کے قاتل ہیں“ مسٹر میکاسا نے کہا ”ان کو قانونی عمل کے ذریعے پھانسی کے تختے تک پہنچانا بڑا مشکل اور پیچیدہ عمل ہوگا۔ جس میں شاید ہمیں بھی گواہی کے لیے پریشان ہونا پڑے۔ ہم مصروف لوگ ہیں سر۔“

اس کے اشارے پر لیڈو نے بڑے سکون سے یہ کام کیا۔ لڑکی کو پیش آنے والے واقعات کا اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ رو رہی تھی اور منت سماجت کررہی تھی۔ خود میرے اعصاب کے لیے یہ سب لے ناقابل برداشت ثابت ہورہا تھا مگر مسٹر میکاسا مسکراتے ہوئے یہ تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ لیڈو لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخ لے کر آگے بڑھا۔ جب لڑکی نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری تو مجھے ... چکر سا آیا اور میرے جسم سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔

ہوش آیا تو میں اوپر ڈرائنگ روم کے صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ صائمہ کا پریشان چہرہ دیکھتے ہی میں اٹھ بیٹھا ”آئی ایم سوری...“

مسٹر میکاسا نے سرہلا کے افسوس سے کہا ”وہ سچ کہہ رہے تھے سر۔ انہیں واقعی کچھ معلوم نہیں تھا۔ خیر، آپ کی امانت میں نے گاڑی میں رکھوادی ہے۔ پورے پچاس لاکھ ہی ہوں گے۔ ہم نے کھول کے دیکھا نہیں۔ گاڑی آپ کو واپس اسپتال پہنچادے گی سر۔ آپ کی گاڑی وہیں موجود ہے نا.... لیکن میری آپ سے پھر التجا ہے۔ انسانیت کے نام پر ان مظلوم انسانوں کے بارے میں ضرور سوچیں جو جانوروں سے بدتر حالات میں جی رہے ہیں۔ بھوک اور جبر کی زندگی سے چھٹکارا دلانے والی موت بھی انہیں آسانی سے نہیں ملتی۔ یہاں آپ پانچ افراد کے قاتلوں پر یہ ظلم نہیں دیکھ سکے۔ وہاں ہزاروں بے گناہ اس سے زیادہ اذیت برداشت کررہے ہیں۔ ان کی مدد کرسکتے ہیں آپ.... انہیں جہنم کے عذاب سے نکالنا ضروری ہے سر۔“

میں نے کہا ”مسٹر میکاسا..... پلیز! میں سب کچھ کرسکتا ہوں مگر اپنے ملک سے غداری نہیں کرسکتا۔“

اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ ”اسے پڑھنے کے بعد شاید آپ کی رائے بدل جائے سر!“

اس لفافے نے مجھ پر چودہ طبق روشن کردیے۔

○☆○

ایک بار پھر میں خانس آرٹ گیلری کے کانفرنس روم میں تھا۔ ہر شخص اسی ترتیب سے بیٹھا ہوا تھا۔ میز کے ایک کنارے پر تاج بخت خان، دوسرے کنارے پر مسز خیال آغا ہی۔ لمبائی کے رخ آمنے سامنے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے سرکاری اور عوامی نمائندے۔ ان سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔

طویل خاموشی کے بعد میں نے کہا ”آئی ایم سوری حضرات اور خاتون۔ میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرتا ہوں۔ آپ کی رقم پوری کی پوری ان سوٹ کیسوں میں موجود ہونی چاہیے۔ میں نے انہیں کھول کے بھی نہیں دیکھا تھا۔ چور پکڑے جاچکے ہیں اور پولیس کی تحویل میں ہیں۔“

تاج بخت نے ناگواری سے کہا ”ہمیں چوروں سے کیا۔“

”انہوں نے چار افراد کے قتل کا اعتراف بھی کرلیا ہے۔ چوکیدار کی بیوی کے بارے میں سرکاری مؤقف کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں کہ اس نے خودکشی کی تھی، اب رہی وہ چیز جو خانس آرٹ گیلری سے چوری ہوئی تھی۔“

بو سب سے اہم تھی؟" تاج بخت بولا۔

"ہاں۔ آپ کے لیے وہی اہم تھی" میں نے کہا "ابھی تک وہ نہیں ملی۔"

"شاید اس لیے کہ پولیس بیچ میں کود پڑی۔ آپ نے کہا تھا کہ اس معاملے میں پولیس کہیں نہیں آئے گی بلکہ دھمکی دی تھی کہ پولیس کو لایا گیا تو آپ یہ کام نہیں کریں گے؟" وزارتِ ثقافت کا نمائندہ بولا۔

"ہاں۔ پہلے میرا یہی خیال تھا" میں نے کہا "لیکن یہ معلوم ہونے کے بعد کہ خانس آرٹ گیلری کی ایک ڈائریکٹر کا عہدہ رکھنے والی خاتون مسز خیال آگاہی کے شوہر ہی واردات کے منصوبہ ساز تھے۔"

"یہ غلط ہے۔ آپ نے بدنام کردیا ہے مجھے۔" مسز خیال آگاہی نے روتے ہوئے کہا "میں ایک نامور مصورہ ہوں۔ آپ لوگ میری کردار کشی کرتے رہے ہیں پہلے بھی۔ بہت ظالم اور سفاک ہوتے ہیں ایسے صحافی جو نجی زندگی کے معاملات کو پبلک میں لا کے اپنی زرد صحافت کا پرچم بلند کرتے ہیں۔ ایسے ہی صحافیوں نے ڈیانا کو مار ڈالا۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری مسز خیال آگاہی۔ جمال آگاہی کی محبت میں سوچے سمجھے بغیر اس سے شادی کرنے کے سوا آپ نے کوئی غلطی نہیں کی۔"

"پھر آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہیں؟"

"یہ بھی غلط ہے۔ شاید خود آپ کو معلوم نہیں تھا کہ جمال آگاہی اس واردات میں کیسے ملوث ہوگیا تھا" میں نے کہا "اور اسے ملوث کرنے والا کون تھا؟"

"اور آپ جانتے ہیں یہ سب؟" تاج بخت بولا۔

میں نے کہا "غالباً... بلکہ یقیناً۔ آج سے پہلے میں نے کبھی چوروں' ڈاکوؤں یا تاوان کے لیے اغوا کرنے والوں کو گرفتار کرانے میں مدد نہیں کی۔ وجہ صاف ظاہر ہے' میں جینا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے یہ کبھی نہیں ہوا کہ میرا واسطہ وطن اور انسانیت کے دشمنوں سے پڑا ہو۔ ڈاکٹر صائمہ' ایڈوانس کا چیک انہیں واپس کردو۔"

ڈاکٹر صائمہ نے اپنے بیگ میں سے چیک نکالا اور خیال آگاہی کو پکڑا دیا۔

ایک اور بوجھل خاموشی کے وقفے کے بعد تاج بخت خان نے کہا "گویا اب اس چیز کے ملنے کی کوئی امید نہیں رہی جس کے لیے ساری تگ و دو تھی۔ جس کی وجہ سے چار..... پانچ افراد مارے گئے۔"

میں نے سوچ کے کہا "یہ تو میں نے نہیں کہا۔ وہ مقدس نقش والا باکس کس کے پاس ہے۔ یہ معلوم ہوگیا ہے مجھے۔"

تاج بخت خان کے ماتھے کی ہر شکن گہری ہوگئی "اچھا؟ پھر نام بتانے میں کیا حرج ہے۔ پولیس خود برآمد کرلے گی۔"

میں نے میز پر رکھتے ہوئے کافی کے مگ سے آخری گھونٹ پیا۔ رومال سے منہ صاف کیا اور کہا "اس کا نام ہے تاج بخت خان۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی ایسی ہی تھی جیسے بم دھماکے کے بعد کچھ دیر کے لیے کان سن ہوجاتے ہیں اور کچھ سنائی نہیں دیتا۔

پھر تاج بخت خان نے برہمی سے کہا "یہ بے ہودہ مذاق ہے یا آپ نشے میں ہیں؟"

میں نے کہا "یہ حقیقت ہے۔ جو تردید کرنے سے بدل نہیں سکتی..... وہ چیز آپ ہی کے پاس ہے چیئرمین صاحب!"

"کسی ثبوت کے بغیر ایسی بات کرنے کا انجام کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "ثبوت...!" اور وہ لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا جو مجھے مسٹر میکا سانے دیا تھا "آپ خود دیکھ سکتے ہیں۔ دوسرے بھی بعد میں دیکھ ہی لیں گے۔"

اس نے لفافے میں سے کاغذات نکالے۔ ان پر ایک نظر ڈالتے ہی تاج بخت خان کا چہرہ زرد پڑ گیا اور اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ میری ہدایات کے مطابق کانفرنس ہال کے ہر دروازے سے سادہ کپڑوں والے پولیس کمانڈوز اندر آکے خاموش کھڑے ہوگئے۔ انہیں قبل از وقت دخل اندازی کی اجازت نہیں تھی۔ ایس پی اسلام آباد اور انسپکٹر رحم دل خان سب کے بعد آئے اور ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

میں نے کہا "بات بہت مختصر ہے تاج بخت خان۔ تم ایک انتہائی دولت مند آدمی ہو۔ تم دنیا کے ہر ملک میں سرمایہ کاری کرچکے ہو۔ معلوم نہیں کیوں اب بھی تمہیں پیسے کی اتنی ہوس ہے حالانکہ خود تمہیں معلوم نہیں ہوگا کہ تمہارے مجموعی اثاثے کتنے ارب یا کتنے کھرب ڈالر کے ہیں۔ تم نے ایسا کیوں کیا آخر؟ جمال آگاہی صرف ہیروئن کا نہیں' شراب' جوا اور خوب صورت عورت' ہر مہنگی عیاشی کا عادی تھا۔ تم نے اسے آلۂ کار بنایا۔ تم اسے سب کچھ فراہم کرتے رہے۔ ایک وقت آیا جب وہ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہوگیا۔ گیلری کے اندر سے کوئی چیز چرانا ناممکن تھا۔ اس نے اپنا ایک وسیلہ اسی طرح پیدا کیا جیسے وہ خود وسیلہ بنا تھا۔ اس نے چوکیدار کو ہیروئن کا عادی بنایا اور اسے اتنی ہیروئن فراہم کی کہ اس کی بیوی تک اس لت کا شکار ہوگئی۔ ان کی زندگی میں سکون آگیا۔ ان کی فرسٹریشن ختم ہوگئی۔ بچے نہ ہونے سے ان کی ازدواجی زندگی میں محرومی کے سخت مسائل تھے۔ ہیروئن کے نشے میں انہوں نے سب بھلا کے خوش رہنے کا مصنوعی سہارا حاصل کرلیا لیکن بعد میں وہ بھی مجبور ہوگئے کہ جمال سے خوشی کا یہ وسیلہ پانے کے لیے اس کی بات مانیں۔ وہ ایک چیز چُرا کے جمال کو دینے پر تیار ہوگئے۔

شاید جمال نے وعدہ کیا ہوگا کہ اس کے بعد تاحیات انہیں سکون کا نسخۂ کیمیا باقاعدگی سے ملے گا۔ جمال کو یہ نسخۂ کیمیا فراہم کرتے تھے ہمارے محترم چیئرمین تاج بخت خان۔ کون نہیں جانتا کہ ان کی سیاسی طاقت کیا ہے اور اس طاقت کے پیچھے جو دولت

ہے' وہ کیسے آئی تھی؟"

"یہ جھوٹ ہے۔ میں عدالت میں ثابت کردوں گا" تاج بخت چلّایا اور جانے کے لیے اٹھا۔

"بیٹھ جاؤ تاج خان!" ایس پی اسلام آباد نے غرا کے کہا اور وہ بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "جمال آگاہی کو ایک آدمی کی ضرورت تھی جو تجربہ کار چور ہو۔ شیر شاہ نے اسے ایک چور سے ملوادیا۔ وہ چور اپنے ساتھ ایک عورت کو بھی لے آیا جس کے چکر میں وہ کافی دن سے تھا۔ آدم کو جنت سے نکلوانے والی عورت تھی۔ اس چور کو لالچ کی راہ دکھانے والی بھی عورت تھی۔ اس کے کہنے پر چور نے جمال آگاہی کو اور پھر چوکیدار کو مارا۔ شیر شاہ کا اور پھر عاقل خان کا قتل کیا۔ حالانکہ وہ بے وقوف اصل چیز پہلے ہی تمہیں پہنچا چکے تھے۔ وہ تمہاری گاڑی تھی جس میں انہوں نے چوری کا مال چھوڑا تھا۔ پولیس تم سے تسلیم کرالے گی کہ نقاب پوش ڈرائیور جو گاڑی میں ریوالور لیے بیٹھا ہوا تھا تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

چوہدری اللہ دتا نے گہری سانس لے کر کہا "بلّے بلّے۔ اپنے چیئرمین صاحب نے کیا کرنے تھے اسٹنگر میزائل!"

میں نے کہا "یہ بڑا اچھا سوال کیا آپ نے چوہدری صاحب۔ اس کے لیے میں تھوڑا سا تاریخی جغرافیہ پڑھاؤں گا آپ کو۔ افریقی ملک سنگانوے میں جو حکومت برسرِاقتدار ہے' وہ ایک سپرپاور کی مدد سے آئی ہے۔ اس حکومت نے ملک میں قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس ملک میں غدار کہلانے والے وہ ہیں جو ایک ڈکٹیٹر کے خلاف اپنے حقوق کی جنگ لڑرہے ہیں۔ بھوک' بیماری اور ظلم سے مرنے والوں کی حالتِ زار کا نقشہ میں اس وقت نہیں کھینچ سکتا۔ یہ سب میں اپنے اخبار "خبرساز" میں لکھوں گا۔ اس سپرپاور کی کٹھ پتلی حکومت نے سنگانوے سے نمائش میں رکھنے کے لیے ایک باکس بھیجا تھا۔ اس کے بارے میں ایک تاریخی روایت اور مقدس نقش کی روحانی اہمیت کا ایک افسانہ بھی سنایا گیا تھا۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ تاج بخت خان صاحب سنگانوے میں تیل کی تلاش کا ٹھیکا لینا چاہتے تھے۔ تلاش اور فروخت کے جملۂ حقوق کا یہ سودا کروڑوں ڈالر منافع کا ضامن تھا اور ہونے ہی والا تھا کہ سنگانوے کے جمہوریت پسند عوام کی بغاوت نے صورتِ حال بدل دی۔ ایک حصہ کمپوریا کے نام سے خودمختار مملکت بن گیا۔ اسی سپرپاور کی وجہ سے جو سنگانوے کی فوجی آمریت کی حامی ہے' بیشتر ممالک کمپوریا کو تسلیم نہیں کررہے ہیں اور اپنے حقوق کی جنگ لڑنے والوں کو اسلحے کی طاقت سے ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن طاقت کے بل پر دنیا کی کس قوم کو غلام رکھا جاسکتا ہے۔ امریکا بہادر کو تینتیس سال کی جنگ میں شکست فاش ہوئی۔ اس سے بڑی وہ اخلاقی شکست تھی جو امریکی قوم نے برداشت کی۔ کمپوریا کا ایک گمنام سپاہی' خاموش اور بے حیثیت سفارت کار مسٹر میکاسا نہ جانے کب سے اسلام آباد کے حکومتی اور سفارتی حلقوں میں جدوجہد آزادی کے لیے حمایت حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے مگر ابھی تک اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ شاید ایسے ہی کچھ لوگ دوسرے ممالک میں بھی رائے عامہ اور حکومت کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوں گے۔ تاج بخت خان نے اندازہ کرلیا کہ جلد یا بہ دیر' جیت حریت پسندوں کی ہوگی۔ بالآخر سنگانوے کو آزاد مملکتِ جمہوریہ کمپوریا کے طور پر تسلیم کیا جائے گا۔ اس نے مسٹر میکاسا کو ایک خط لکھا کہ جو کام تمہاری ڈپلومیسی نہیں کرسکی وہ میری مدد سے ممکن ہے۔ بشرطیکہ تم میرے ساتھ ایک ایگریمنٹ کرلو کہ برسرِاقتدار آنے کے بعد تیل کی ساری رائلٹی پر میرا حق ہوگا۔ میکاسا کو پانچ اسٹنگر میزائل چاہئیں۔ اس کے ہدف پہلے سے طے ہیں۔ غیر ضروری خون خرابا روکنے اور جلد از جلد کمپوریا کی عوامی حکومت قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جنگ ختم ہو۔ فوجی آمریت کی حکومت کے مرکز ختم ہوجائیں تو جنگ خود بخود ختم ہوجائے گی مگر میکاسا اپنے ملک کے مفادات کا سودا کرنے پر تیار نہیں تھا۔ تیل کی دولت کو وہ کسی بھی غیر ملکی کے حوالے کیسے کردیتا۔ جو خط اور معاہدے کی دستاویزات تاج بخت خان نے مسٹر میکاسا کو اس امید پر فراہم کی تھیں کہ وہ ان پر ہنسی خوشی فوراً دستخط کردے گا۔ یہ بات یقینی تھی کہ بعد میں وہ انقلابی حکومت میں اہم عہدے پر فائز ہوگا اور اس معاہدے پر عمل درآمد میں مددگار ثابت ہوگا مگر افسوس کہ اس نے خط اور معاہدہ مجھے تھمادیا۔ اس کی اصل محفوظ ہے۔ تاج بخت خان اس کی نقل دیکھ چکے ہیں.... باقی سب

لوگ جو تاج بخت خان کے منصوبے کی وجہ سے مارے گئے‘ شاید اسی انجام کے مستحق تھے۔ پکڑے جانے والے دو چور‘ ایک چور اور دوسری چورنی‘ بے وقوف تھے۔ وہ صرف پچاس لاکھ مجھ سے اینٹھنا چاہتے تھے۔ پچاس لاکھ آدمی کو پاگل کردینے کے لیے کافی ہیں۔ اگر وہ کامیاب ہوجاتے تو بعد میں پکڑے جاتے۔ ایک آخری دلچسپ بات... مسٹر میکاسا کو تاج خان نے یہ بتایا تھا کہ وہ چوری ہوجانے والی چیز‘ جس میں اسٹنگر میزائلوں کے بارے میں تمام معلومات ہیں‘ انہوں نے اپنا پیسہ خرچ کرکے پچاس لاکھ میں چوروں سے خریدلی ہے اور انہیں اسٹنگر میزائل مل سکتے ہیں اگر وہ معاہدے کی توثیق کردیں۔

ایس پی اسلام آباد نے میرے کان میں کچھ کہا ”آپ خود بتادیں یہ بات جناب ایس پی صاحب“ میں نے کہا۔

”ہم نے چوروں کا مال برآمد بھی کرلیا ہے“ ایس پی نے کہا۔

”میرا مشورہ ہے سر۔ اسٹنگر میزائل واپس امریکا بہادر کو دے کر پچاس لاکھ ڈالر وصول کرلیں اور اس واقعے کو بھول جائیں۔ میں بھی بھول جاتا ہوں۔ تاج بخت خان عزت دار آدمی ہیں۔ دولت مند ہیں اور بہت سیاسی اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے ہمارے ملک میں۔ یہاں کا قانون اور نظام انصاف ان کی مٹھی میں رہتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ کو ترقی معکوس دے کر ڈی ایس پی بنادیا جائے اور مجھ پر بھینس کی چوری کا یا پولیس کی ٹوپی چرانے کا مقدمہ بن جائے۔ ہوسکتا ہے آپ بہادر ہوں مگر میں..... بزدل ہوں۔“

تاج بخت خان مسکرایا ”بزدل نہیں..... تم سمجھ دار ہو۔ اگر کبھی تمہیں ضرورت پڑے..... تو آجانا میرے پاس.... ایک اچھے پی آر او کی ضرورت رہتی ہے مجھے۔“

میں نے اٹھتے ہوئے کہا ”تھینک یو سر..... بزدل ہونے کے علاوہ میں پاگل بھی ہوں تھوڑا سا۔ اپنے علامہ اقبال صاحب کی بات مانتا ہوں..... اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی۔“

”پرواز..... پرواز کا کیا وقت ہے کراچی کے لیے؟“ صائمہ نے گھڑی دیکھ کے کہا ”مجھے ابھی شاپنگ بھی کرنی ہے۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا ”تم کرو شاپنگ اطمینان سے۔ اپنا یار انسپکٹر رحم دل خان جہاز کو روک کے رکھے گا۔ جیسے یہ مسافروں سے بھری بس کو روک کے ڈرائیور کے کاغذات دیکھتا رہتا ہے۔“

”انسپکٹر.....“ ظالم خان نے آنکھیں نکالیں ”اب میں ڈی ایس پی ہوں۔ پانچ.... سوری‘ چار قتل کے مجرم گرفتار کیے ہیں میں نے۔“

○☆○

اناؤنسر نے اپنی بیزار آواز میں ایک ناقابل فہم اعلان کیا مگر میں نے اسے سمجھ لیا۔ وہ کراچی کی فلائٹ کے مسافروں سے ڈانٹنے کے انداز میں التماس کررہی تھی کہ وہ جہاز میں تشریف رکھیں۔

میں نے میکاسا سے ہاتھ ملایا ”مجھے امید ہے مسٹر میکاسا کسی دن جب کمپوریا کی جدوجہد آزادی میں کامیابی کے جشن کی تقریبات ہوں گی‘ میں اپنے اخبار کا نمائندہ بن کے آؤں گا۔ تم سے پھر ملاقات ہوگی تو تم مجھے پہچاننے سے انکار تو نہیں کروگے؟“

”اوہ نو سر۔ یہ آپ نے کیسے فرض کرلیا؟“

”وزیراعظم تو بڑی چیز ہے۔ وزیر بننے کے بعد بھی لوگ صرف انہی کو پہچانتے ہیں جن سے کوئی غرض وابستہ ہو۔“

”ایسا نہیں ہے سر۔ ہم مروت اور اخلاق والے لوگ ہیں۔“

”تمہارے دل میں میرے خلاف کوئی رنجش نہیں؟“ میں نے کہا۔

”بے شک آپ نے میری بات نہیں مانی..... مگر وہ اصول کی بات تھی اور اصول بیچنے والے کسی غدار کو میں شاید بعد میں پہچاننے سے انکار کردیتا۔ آپ کی مجبوری‘ ضمیر کی مجبوری تھی۔ ہوس کی مجبوری نہیں تھی۔ خوف کی مجبوری نہیں تھی۔ اس کے علاوہ سر.....! آپ کو بھی کیا حاصل ہوا اس سے‘ خواری کے سوا؟ پانچ لاکھ کا ایک چیک تھا‘ وہ بھی واپس کردیا آپ نے۔“

میں نے کہا ”مسٹر میکاسا! بعض معاملات ہی ایسے ہوتے ہیں جن میں کچھ لینا ممکن نہیں ہوتا۔ الٹا بہت کچھ دینا پڑتا ہے۔ کبھی جان کا نذرانہ تک پیش کرنا‘ ایک قابل فخر احساس بن جاتا ہے اور ایسے زندگی کی قربانی دینے والے کو ہم شہید کہتے ہیں۔ آدمی شہید ہوتا ہے محبت میں۔ محبت کسی اصول سے ہو‘ اپنے وطن سے یا عقیدے سے یا پھر ڈاکٹر صائمہ جیسی کسی طلب گار جاں سے...“

صائمہ کا رنگ سرخ ہوگیا۔ مسٹر میکاسا ہنسا ”آپ کو بزدل کہنا غلط ہے جو ایسے جان ہتھیلی پر رکھ کے پھرتا ہو۔ میں آپ کے جذبات سے بہت متاثر ہوا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ جو میرے پاس ہے وہ سب لے لو۔ آپ کی نیک خواہشات ضرور ہمارے لیے تھیں۔“

”اور آئندہ بھی رہیں گی۔ آخری فتح تک جو تمہاری ہوگی“ میں نے اس سے ہاتھ ملایا ”آزادی اسلحے سے نہیں‘ جذبے سے حاصل ہوتی ہے۔“

”سوائے تمہارے۔ تم جذبے سے آزادی نہیں‘ غلامی حاصل کرنا چاہتے ہو“ ظالم خان چلتے ہوئے بولا ”ایک عورت کی غلامی۔“

”وہ تو تمہارے باپ نے بھی کی تھی“ میں نے صائمہ کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ صائمہ نے یہ ظاہر کیا جیسے اس نے کچھ نہیں سنا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا اور مسٹر میکاسا کو ہاتھ ہلایا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہ اتنی آسانی سے باز آنے والا شخص نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ اسٹنگر میزائل حاصل کرنے کے لیے کوئی نیا چکر چلائے گا اور کامیاب بھی ہوجائے گا کیونکہ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ مثلاً صائمہ کے دل میں۔

● ●